اگست ۱۹۸۹ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
ہدایت القرآن (قسط ۳۲)	مولانا محمد تقی امینی	۳
کاروانِ حدیث (۴)	عبدالرشید عراقی	۱۰
کیا اسلام سیکولرزم کا علمبردار ہے؟	توقیر عالم فلاحی	۱۳
لغات و اعرابِ قرآن (۵)	پروفیسر حافظ احمد یار	۲۱
منشورِ اسلام (۱۳)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین	۴۹
گوشۂ مقصود	ڈاکٹر حافظ محمد مقصود	۵۸

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقابل ہے آئینہ

کراچی کی آگ کو بھڑکانے میں کس کس کا ـــ کتنا کتنا حصّہ ہے؟

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پندرہ برس بعد ـــ سندھ کیوں جل رہا ہے؟

پنجابی سندھی کشمکش ـــ مہاجر پٹھان تصادم کیوں بن گئی؟

کیا اِس شر میں کچھ خیر بھی ہے؟

سیاسی محرومیوں، انتظامی بے تدبیریوں، حکمرانوں کے آمرانہ طرزِ عمل، اپنوں کی مہربانیوں اور غیروں کی سازشوں کا ـــ بے لاگ تجزیہ

اصلاحِ احوال کی مثبت تجاویز

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا تازہ سلسلہ مضامین

استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ

کتابی صورت میں دستیاب ہے

ہر درد مند پاکستانی کے لیے اِس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے

---

۱۴۴ صفحات، سفید آفسٹ کاغذ، قیمت صرف ۱۵/ روپے

ملنے کا پتہ : ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور- فون: ۸۵۲۶۸۳

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماھنامہ

حکمتِ قرآن

لاھور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

معاون امور انتظامی: حافظ خالد محمود خضر

جلد ۸ | اگست ۱۹۸۹ء، مطابق محرم الحرام ۱۴۱۰ھ | شمارہ ۸

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶-کے- ماڈل ٹاؤن- لاھور فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون ۴۰/- روپے فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاھور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

قرآن کالج ـــــ داخلے شروع ہیں

قرآن کالج میں ایف اے میں داخلے کے لیے درخواستیں جمع کرانے کی آخری تاریخ ۳۱ ر اگست معین کی گئی ہے۔ جیسا کہ قارئین کے علم میں ہے، قرآن کالج میں ایف اے کلاس کے اجراء کا فیصلہ اسی سال سے کیا گیا ہے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے محدود وسائل کے پیش نظر، کہ جس میں حکومت کی کوئی گرانٹ شامل ہوتی ہے نہ پٹرو ڈالر کی کوئی آمیزش، فی الحال کالج میں طلبہ کے لیے جو نصاب معین کیا گیا ہے اس میں طلبہ کے لیے مضامین کے انتخاب کی گنجائش بہت کم رکھی گئی ہے۔ سائنس کے مضامین کو نصاب میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ تو پہلے سے تھا ہی، آرٹس کے مضامین میں سلیکشن کی گنجائش بھی سردست کچھ زیادہ نہیں ہے۔ صورت حال کچھ اس طرح ہے کہ انٹرمیڈیٹ بورڈ کے مطابق ایف اے میں انگریزی، اردو، مطالعہ پاکستان اور اسلامک سٹڈیز لازمی مضامین کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ اردو اور انگریزی کا شمار مرکزی مضامین میں ہوتا ہے اور فائنل امتحان میں ان دونوں کے لیے دو دو سو نمبر مخصوص ہوتے ہیں۔ مطالعہ پاکستان اور اسلامیات ضمنی مضامین شمار ہوتے ہیں اور ہر دو کے لیے کل پچاس پچاس نمبر مخصوص ہوتے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ ایف اے کے طلبہ کو تین انتخابی (ELECTIVE) مضامین کا چناؤ کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کالج میں چونکہ عربی زبان کی تعلیم پر غیر معمولی زور ہوگا اور دینی تعلیم کا ایک معین نصاب بھی طلبہ کو پڑھایا جائے گا لہٰذا انتخابی مضامین میں سے عربی اور اسلامیات قرآن کالج کے ہر طالب علم کے لیے لازمی مضامین شمار ہونگے۔ تیسرے انتخابی مضمون کے بارے میں طلبہ کو اختیار ہوگا کہ وہ معاشیات، سیاسیات یا فلسفہ میں سے کوئی ایک مضمون اپنے لیے منتخب کرلیں۔

تاہم مذکورہ بالا تمام محدودیت کے باوصف قرآن کالج اپنے جلو میں کشش کے کئی پہلو رکھتا ہے بالخصوص اُن لوگوں کے لیے جن کی ترجیحات دنیاوی منافع تک محدود نہیں ہیں بلکہ آخرت کو وہ دنیا پر مقدم جانتے ہیں۔ قرآن کالج کے امتیازی پہلو حسب ذیل ہیں۔

(باقی صـ ۴۸ پر)

امتِ مسلمہ کی عالمی قیادت کے لیے چند بنیادی انتظامات

(۳) دین کو کامل و مکمل کر دینے کی بشارت

دین کا سلسلہ شروع سے چلا آرہا تھا ہر پیغمبرؑ اور نبیؐ نے اسکی تعلیم دی اور اسی کے ذریعہ دینی قیادت قائم کی لیکن اس کو کامل و مکمل کر دینے کا مرحلہ ابھی باقی تھا جس کے لیے وقت کا انتظار تھا۔ اور جو عالمی قیادت کے لیے ضروری تھا۔ ذہنی و عملی صلاحیت کے لحاظ سے اب اس کا وقت آگیا تھا اس بنا پر اس کو کامل و مکمل کر دینے کی خوشخبری دی گئی جو پوری ہوئی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو نہ خود کی نگاہ پیدا ہوتی اور نہ خود پر اعتماد ہوتا جس سے ذہنی و عملی صلاحیت کو آگے بڑھانے میں رکاوٹ ہوتی اور ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھانے اور وحی کا انتظار کرنے کی ضرورت ہوتی (جیسا کہ پچھلی قوموں میں یہ ہوتا رہا ہے) پھر عالمی قیادت اپنی قوت و شوکت کے ساتھ نہ ظاہر ہوتی۔

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (البقرہ - ۱۵۰)

تاکہ لوگوں کو تم پر کوئی حجت نہ رہے[1] سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ہٹ دھرم ہیں تو ان سے تم نہ ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو۔ اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کر دوں[2] اور تاکہ تم ہدایت پاؤ[3]

---

[1] جب تک خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم نہیں آیا تھا اس وقت تک اہل کتاب رسول اللہ اور مسلمانوں کو الزام دیتے تھے۔ کہ ان کا قبلہ تو وہی بیت المقدس ہے جو ہمارا ہے لیکن نماز اور عبادت

کے طور طریقے ان کے ہم سے جداگانہ ہیں۔ دین و مذہب کے معاملہ میں اس قسم کی تفریق کا پروپیگنڈا نہایت خطرناک ہوتا ہے اللہ نے اس حکم کے ذریعہ ہمیشہ کے لیے یہ دروازہ بند کر دیا۔

۲؎ نعمت تمام کر دینے سے مراد دین کو کامل و مکمل کر دینا ہے جیسا کہ دوسری جگہ نعمت تمام کر دینے کا مطلب دین کو کامل کر دینا ہی سمجھا گیا ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدۃ: ۳)

"آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے اوپر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین (کی حیثیت سے) پسند کیا"

۳؎ یہ ہدایت یابی و راہ یابی امت مسلمہ کے مقام و منصب کے لحاظ سے ہے۔

(۴) اعلیٰ درجہ کی سربراہی کے تحت تعلیم و تربیت کا انتظام

انسان کی بناوٹ ہی اس قسم کی ہے کہ اس میں نیکی اور بدی دونوں طاقتیں موجود ہیں دینی قیادت تو قائم اور برقرار رکھنے کے لیے بدی کی طاقت کو دبانے اور نیکی کی طاقت کو ابھارنے کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے جس کے لیے مستقل تعلیم و تربیت کے بغیر چارہ نہیں ہے اللہ نے اپنی کتاب اور اپنے رسولؐ کے ذریعہ دونوں کا انتظام کیا اور اس کے لیے جو پروگرام تجویز کیا اور جس پر عمل کرایا اس کی حفاظت اور اس کو باقی رکھنے کا بندوبست کیا اس پروگرام میں اللہ کی یاد اور اس کی شکر گذاری کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝ (البقرہ - ۱۵۱-۱۵۲)

جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسولؐ تم ہی میں سے بھیجا جو تمہارے سامنے ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تمہیں پاک و صاف کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور دانائی کی باتیں سکھاتا ہے اور تمہیں وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے بس تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کرونگا اور میری شکر گزاری کرو اور ناشکری نہ کرو ۴؎

لہ یعنی خانہ کعبہ کو قبلہ بنانا اور دین کو کامل و مکمل کر دینا وغیرہ ایسے ہی بڑے مقصد کے تحت ہیں جیسے کہ بڑے مقصد کے تحت ہم نے رسولؐ بنا کر تم میں بھیجا (نبوت و ختم نبوت کی بحث کسی موقع پر آگے آئیگی)

لہ تعلیم و تربیت کے پروگرام میں اللہ کی یاد اور اس کی شکر گذاری کی حیثیت گویا اللہ سے ایک معاہدہ کی ہے یعنی اگر تم مجھے یاد رکھو گے تو میں تمہاری مدد کرتا رہونگا اور اگر تم مجھے بھول جاؤ گے تو میری مدد کا ہاتھ اٹھ جائیگا پھر تم اپنی بڑائی کھو دو گے اللہ کی یاد میں ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا بھی ہے جو عالمی قیادت اور مقام شہادت کی مناسبت سے اس امت کے سپرد ہیں اسی طرح بندوں کی یاد میں اللہ کی طرف سے مدد، فتح اور دنیا و آخرت میں کامیابی و سربلندی بھی ہیں۔

راہ کی مشکلات سے آگاہی

ترقی و بلندی کی راہ میں مشکلات پیش آنا ضروری ہیں یہ راہ ہمیشہ آزمائش کی رہی ہے آسائش کی کبھی نہیں رہی ہے۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مشکلات اس لیے نہیں پیش آتی ہیں کہ اٹھا ہوا قدم رکے بلکہ اس لیے آتی ہیں کہ اور مضبوطی کے ساتھ قدم اٹھایا جائے پھر کام جتنا بڑا اور مقصد جتنا عظیم ہوتا ہے اسی کی مناسبت سے مشکلات کی تجویز ہوتی ہے۔ اس تجویز میں اس "آبگینہ" کو بھی دیکھا جاتا ہے جس کو مشکلات کے پتھر سے چکنا چور کیا جاتا ہے اس اندرونی طرف یا پیمانہ کو بھی دیکھا جاتا ہے جس میں مشکلات کے ذریعہ بڑے کام اور مقصد کی صلاحیتیں پیدا کی جاتی ہیں۔ آیتوں میں پہلے مشکلات پر قابو پانے کی تدبیروں پھر بڑی چھوٹی آزمائشوں اور ان کے صلہ کا ذکر ہے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ (البقرہ - ۱۵۳ - ۱۵۷)

اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد لیا کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مرا ہوا نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے
ہو[۲] اور ہم تمہاری کچھ آزمائش (خطرات کے) خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں
اور پھلوں کے نقصان سے ضرور کریں گے ان صبر کرنے والوں کو جو مصیبت پہنچنے
پر "انا للہ وانا الیہ راجعون" (بیشک ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف
واپس جانے والے ہیں) کہتے ہیں خوشخبری دیدیجئے کہ انہیں پر انکے رب کی طرف
سے خاص نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت پائے ہوئے ہیں[۳]۔

---

[۱] صبر اور نماز سے مدد حاصل کرنے کا ذکر البقرہ رکوع ۵ آیت ۴۵ میں گذر چکا ہے وہیں دیکھ لیا جائے۔

[۲] یہ بڑی آزمائش ہے جو اس حقیقت کے اعلان کے ساتھ زندگی پر ختم ہوتی ہے کہ "ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی" یعنی یہ آزمائش ایک نئی زندگی سے روشناس کراتی ہے جسکا نام "شہادت" ہے اور جس میں جان باقی رہنے کا نہیں بلکہ جان دے دینے کا نام زندگی ہے۔ لیکن یہ نئی زندگی مرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے جس کی پوری حقیقت سے واقفیت ہماری سمجھ بوجھ کے دائرہ میں زیادہ نہیں آتی ہے اسی بنا پر فرمایا۔ ولکن لا تشعرون (لیکن تم سمجھتے نہیں ہو)۔

[۳] یہ چھوٹی آزمائشوں کا ذکر ہے جو دنیوی زندگی کے لیے خاص نقطۂ نگاہ عطا کرتی ہیں وہ یہ کہ ہم اور ہماری ساری چیزیں اللہ کی ہیں ہماری حیثیت امین (امانتدار) کی ہے مالک کی نہیں ہے اسی کی مرضی اور اسی کی مقرر کی ہوئی حدوں کے مطابق ہے آزادانہ اور خود مختارانہ نہیں ہے۔

تاریخ کی یہ داستان نہایت دکھ بھری ہے کہ گراوٹ و پستی کے زمانہ میں یہ نقطۂ نگاہ نظروں سے اوجھل ہو گیا پھر مذہبی ذہن سرمایہ داری کا محافظ بنتا رہا جس کی بنا پر مذہبی نمائندے اور سرمایہ دار دونوں مظلوموں کو دبانے اور انسانیت کو ذلیل کرنے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے رہے اصلاح و انقلاب کی تحریکیں اور تنظیمیں بھی موجود رہیں اور ان کے دعویٰ بھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہے لیکن ان کی سطح اتنی بلند نہ ہو سکی کہ اپنے اپنے فائدہ کو قربان کر کے مظلوموں کی حمایت اور انسانیت کو اٹھانے میں کوئی نمایاں کام انجام دے سکیں۔

اللہ کے شعائر کی حفاظت و تعظیم

"شعائر" ۔ شعیرہ کی جمع ہے "شعیرہ" اس کو کہتے ہیں جس کو کسی حقیقت یا گہری بات کی یاد تازہ رکھنے کے لیے علامت و نشانی کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے ۔ قومی و جماعتی زندگی میں "شعائر" کی بڑی اہمیت ہے اس "رسم" کی نہیں جو انکے نام سے کی جاتی ہے بلکہ اس روح اور قوت کی جو اس میں پوشیدہ ہوتی ہے اور جس کی یاد دھانی کے لیے شعائر مقرر کئے جاتے ہیں ۔ پھر عالمی قیادت کے لیے جس کا انتخاب کیا جاتا ہے اس کی زندگی میں تو "شعائر" کی اہمیت اور زیادہ ہوتی ہے ۔ ان کی حفاظت اور تعظیم سے ہی وہ اپنے کو سنبھال سکتی اور اپنا وقار و امتیاز قائم رکھ سکتی ہے ۔

شعائر بہت ہیں کسی اور موقع پر ان کی تفصیل آئے گی ۔ یہاں خانہ کعبہ کا ذکر دور سے چلا آرہا ہے جو بہت بڑا شعیرہ ہے اور جس سے اللہ کے ساتھ محبت اور قربانی کی بڑی یادگاریں وابستہ ہیں ۔ صفا و مروہ کا تعلق بھی خانہ کعبہ اور اس کی یادگاروں سے ہے اس بنا پر ان کا شمار بھی "شعائر" میں کیا گیا ۔ صفا و مروہ سے متعلق یادگار کا وہ حصہ ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنے شیر خوار بچہ اور اس کی ماں (اپنی بیوی) کو جنگل و بیاباں سنسان میدان میں چھوڑ کر چلے گئے تھے ۔ جہاں دور دور تک سبزی و پانی کا نشان نہ تھا ۔ بچہ کی شدت پیاس کے عالم میں ماں کی "مامتا" تڑپ رہی تھی اور پانی کی تلاش میں صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا پہاڑیوں کا چکر لگا رہی تھی کہ شاید کوئی قافلہ آتا جاتا نظر آئے اور اس کے پاس پانی مل جائے ۔ یہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی (دوڑ) اس کی یادگار ہے جو اب بھی روح کو تازگی اور ایمان کو قوت دیتی ہے ۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ (البقرہ - ۱۵۸ - ۱۶۲)

بیشک صفا اور مروہ اللہ کی یادگاری نشانیوں میں سے ہیں۔ جو کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے کہ ان دونوں کے درمیان طواف (سعی - دوڑ لگائے) کرے[1] اور جس نے بھی دل کی خوشی سے خیر و بھلائی کے کام کیے تو بلاشبہ اللہ قدر کرنے والا جاننے والا ہے۔ بیشک جو لوگ ان کھلی کھلی ہدایت کی باتوں کو جنھیں ہم نے اتارا ہے اس کے بعد بھی چھپاتے ہیں جبکہ ہم نے لوگوں کے لیے کتاب میں ان کو بیان کر دیا ہے تو انہیں لوگوں پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں[2] ہاں جن لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی اور ظاہر کر دیا تو ان لوگوں کی میں توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہوں۔ بیشک جن لوگوں نے انکار کیا اور انکار ہی کی حالت میں مر بھی گئے تو ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ان کے عذاب میں نہ تخفیف ہوگی اور نہ ان کو مہلت دی جائیگی[3]"

---

[1] یہ دراصل "سعی" ہے جس کے معنی دوڑنا ہیں اس میں چونکہ کئی چکر ہوتے ہیں اور طواف کی شکل پائی جاتی ہے اس بنا پر اسکو طواف کہا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے حج کے مراسم میں بہت سی تبدیلیاں کر لی گئی تھیں اور صفا و مروہ دونوں پہاڑیوں پر بھی بت رکھ دیئے گئے تھے جس کی بناء پر کچھ لوگوں نے پہلے ہی سعی کرنا چھوڑ دیا تھا اب اسلام کے بعد لازمی طور سے حرج کا شبہ ہوا آیت میں اسی حرج کو دور کیا گیا ہے۔

[2] یہودیوں کی کوشش اور سازش یہ رہی ہے کہ خانہ کعبہ کی مرکزیت ختم کر کے بیت المقدس کو مرکز بنایا جائے اس کی خاطر انہوں نے حق باتیں چھپائیں اور بہت سے تاریخی واقعات جھٹلائے یہاں تک کہ قربانی کی جگہ کہیں اور لے گئے اور ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ کے بجائے حضرت اسحاقؑ کو ثابت کرنے کی کوشش کی جبکہ ان کی کتاب میں وضاحت بھی موجود تھی، آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

تاریخی حقائق کو چھپانے اور جھٹلانے کی بات نئی نہیں ہے گراوٹ و پستی کے زمانہ میں قومیں بالعموم اس جرم کا ارتکاب کرتی ہیں اور نہ معلوم کتنی غلط باتیں اپنی تاریخ میں داخل کر دیتی ہیں جو بعد میں تاریخ کا جزء بنتی ہیں اور ان کا نکالنا مشکل ہوتا ہے۔

اس کا مشاہدہ سوانح نگاری میں بھی کیا جاتا ہے سوانح نگار کی کوشش ہوتی ہے کہ ماضی و حال کے ہر کارنامہ کو اپنے اور اپنے بزرگوں کی طرف منسوب کر دے جس کی خاطر نہ معلوم کتنی غلط باتیں یا غلط نسبتیں اس میں شامل کی جاتی ہیں۔ اس میں وہ حضرات بھی مل جائیں گے جن کے تقویٰ و تقدس پر عام حالت میں شبہ نہیں کیا جاتا ہے لیکن جب سوانح میں اپنے اور اپنے خاندان کی بالادستی دکھانی ہوتی ہے تو نہ معلوم انکا کیا حال ہو جاتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح نگاری میں نہ علمی انداز نظر پیدا ہوتا ہے اور نہ ریسرچ و تحقیق کا کوئی معیار قائم رہتا ہے۔

۲ حق بات کا انکار کرنا اس کو چھپانا تاریخ میں غلط باتیں داخل کرنا یا غلط نسبتیں قائم کرنا یہ سب نہایت سنگین جرم ہیں ان کی سزا لعنت بھی سنگین سزا ہے جو دینی قیادت و سرداری کی نعمت سے جوڑ نہیں کھاتی ہے جس قوم یا فرد کی حرکتوں پر لعنت کا اعلان ہوتا ہے وہ لعنت کرنے والوں کی نظر میں دینی قیادت و سرداری کا اہل نہیں رہتا ہے سبھی اس کے خلاف یہ اعلان کیا جاتا ہے۔

ہر ہجری سال نو کے موقع پر

سانحہ کربلا

تقاریر، خطابات، مضامین اور مقالات کا موضوع بنتا ہے؟

اور اس کے ضمن میں عموماً افراط و تفریط کا مظاہرہ ہوتا ہے

ڈاکٹر اسرار احمد

کا کتابچہ

خود پڑھئے اور دوسروں تک پہنچائیے

مجموعہ سال نو اور

سانحہ کربلا

مع کربلا کی کہانی حضرت ابو جعفر محمد باقرؒ کی زبانی

اس موضوع پر حقیقت بینی اور اعتدال پسندی کے اعتبار سے ایسا شاہکار ہے جس نے عوام و خواص سے خراج تحسین وصول کیا ہے

۴۸ صفحات - اعلیٰ آفسٹ پیپر - قیمت ۴ روپے

ناشر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نمبر ۱۲

عبدالرشید عراقی

محدثین کرام کی علمی خدمات

امام بقی بن مخلد قرطبی (م276ھ)

امام بقی بن مخلد جن کی کنیت ابو عبدالرحمان تھی 201ھ میں قرطبہ میں پیدا ہوئے[1] اور 75 سال کی عمر میں 276ھ میں قرطبہ ہی میں انتقال کیا[2]

آپ کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ بقی بن مخلد نے 23 اساتذہ وشیوخ سے استفادہ کیا۔ امام احمد بن حنبل (م241ھ) کا نام بھی آپ کے اساتذہ کی فہرست میں ملتا ہے[3]

امام بقی بن مخلد فقہ واجتہاد میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ کسی خاص امام یا مذہب کے پابند نہ تھے بلکہ خود فقیہ، مجتہد اور صاحبِ اختیارات تھے۔ علامہ ابن عساکر (م871ھ) لکھتے ہیں۔

کان مجتہدا متخیرا لا یقلد احدا[4]

یعنی وہ مجتہد صاحب اختیارات اور کسی امام کے مقلد نہ تھے۔

علمائے کرام نے ان کے فضل وکمال، زہد وورع، عدالت وثقاہت، حفظ وضبط اور تبحر علمی کا اعتراف کیا ہے۔ ذہبی نے آپ کو احد الائمۃ الاعلام کے لقب سے یاد کیا ہے[5]

مسند کبیر۔ آپ کی سب سے عظیم الشان اور اہم کتاب ہے۔ جس میں 13 سو سے زیادہ صحابہ کرام کی احادیث جمع کی گئی ہیں۔ حافظ ابن جوزی (م597ھ) اور علامہ ابن کثیر (م774ھ) نے 16 سو سے زیادہ صحابہ کرام کی احادیث کے بارے میں نشاندہی کی ہے۔ اس کی ترتیب فقہی ابواب پر کی گئی ہے اس لئے اس کو مصنّف اور مُسند دونوں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

امام ابن حزم (م456ھ) اس کی افادیت اور عظمت کے قائل تھے۔ اور اس کو

مسند امام احمد ابن حنبل پر ترجیح دیتے تھے لیکن علامہ ابن کثیر (م774ھ) فرماتے ہیں کہ ابن حزم کا یہ بیان محل نظر ہے۔ مسند احمد بن حنبل اس سے زیادہ جامع وجیّد کتاب ہے[۲۷]

امام ترمذی (م279ھ)

امام ترمذی کا نام محمد بن عیسیٰ اور کنیت ابو عیسیٰ تھی۔ 205ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے[۲۸] اور 74 سال کی عمر میں 279ھ میں آپ کا انتقال ہوا[۲۹] امام ترمذی نے ابتدائی تعلیم خراسان اور ماوراءالنہر میں حاصل کی بعد ازاں تحصیل حدیث کے لئے دوسرے اسلامی شہروں کا سفر کیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م852ھ) لکھتے ہیں۔

طاف البلاد وسمع خلقا من الخراسیین والحجازیین والعراقیین[۳۰]

یعنی مختلف شہروں کا سفر کیا اور خراساں' حجاز اور عراق کے ارباب کمال سے استفادہ کیا۔

امام ترمذی کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ارکان صحاح میں امام بخاری (م256ھ) امام مسلم (م261ھ) اور امام ابو داؤد (م275ھ) آپ کے اساتذہ ہیں۔

امام ترمذی کا اپنے شیخ امام بخاری کی طرح حافظہ بہت قوی تھا۔ ارباب سیر نے آپ کے حافظہ کی توثیق کی ہے[۳۱]

امام ترمذی کے حفظ و ضبط' عدالت و ثقاہت' تبحر علمی' زہد و ورع اور تدیّن و تیقّن کا علمائے کرام نے اعتراف کیا ہے اور اس میں آپ اپنے شیخ امام محمد بن اسمٰعیل بخاری (م256ھ) کے جانشین تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م1229ھ) لکھتے ہیں

تورع وزہد بحدے داشت کہ فوق آں متصور نیست بخوف الہی بسیار گریہ وزاری کردتا نابینا شد[۳۲]

یعنی زہد و تقویٰ اس قدر حاصل تھا کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور خوف الٰہی سے کثرت سے گریہ وزاری کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آنکھوں کی

بینائی جاتی رہی۔

امام ترمذی کے مسلک میں اختلاف ہے۔ علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ (م1352ھ) نے ان کو شافعی المذھب لکھا ہے[۱۲] لیکن جمہور علمائے کرام کی رائے یہ ہے کہ آپ مقلد نہ تھے بلکہ مجتہد مطلق تھے۔

جامع الترمذی۔ آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں درج ذیل آٹھ قسم کے مضامین ہوں۔ سیر، آداب، تفسیر، عقائد، فتن، احکام، اشراط، مناقب۔ جامع ترمذی حدیث و فقہی فوائد اور سلف و خلف کے مذاہب کی جامع ہے۔ مجتہد کے لئے کافی اور مقلد کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م1176ھ) کے نزدیک جامع ترمذی، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد تینوں کی بعض خصوصیات کی جامع ہے[۱۳]

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م1239ھ) لکھتے ہیں۔

> جامع ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے۔ بلکہ بعضے وجوہ اور حیثیات سے..... دوسرے فقہاء کے مذاہب اور ان کے استدلال کے ذکر کی حیثیت سے..... تیسرے حدیث کے اقسام صحیح، حسن، ضعیف، غریب معلّل بعلل کے ذکر کی حیثیت سے..... اور چوتھے رواۃ کے نام، ان کے القاب اور کنیتوں اور علم رجال کے متعلق دوسرے فوائد کی حیثیت سے[۱۴]

جامع ترمذی کے ساتھ علمائے کرام نے بڑا اعتنا کیا ہے اس کی شروح لکھیں، حواشی لکھے، مختصرات مرتب کئے، اس کے مشکلات حل کئے۔ اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بیش قیمت ذخیرہ فراہم کیا۔ علامہ ابن العربی مکی (م546ھ) علامہ ابن سید الناس شافعی (م734ھ) علامہ سیوطی (م911ھ) علامہ شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی (م1329ھ) علامہ عبدالرحمان محدث مبارک پوری (م1353) اور مولانا بدیع الزمان حیدر آبادی (م1304ھ) کے نام شارحین جامع ترمذی میں ملتے ہیں۔ **(جاری ہے)**

1۔ ابن عساکر تاریخ ابن عساکر ج3، ص277

2۔ ایضا ص278

3۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج2، ص204، ابن عساکر، تاریخ ابن عساکر ج3، ص277۔

(باقی صـ۵۵)

نقطۂ نظر

کیا اسلام سیکولرزم کا علمبردار ہے؟

توقیر عالم فلاحی
استاد شعبۂ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اسلام اور سیکولرزم پر گفتگو کرنے سے پیشتر اسکے معنیٰ و مفہوم کی طرف رجوع کیا جائے۔ نیو ویبسٹرس ڈکشنری میں اس کی تعریف یوں ہے۔

A system of beliefs which rejects all forms of religious faith and worship; The view that public education and other matters of civil policy should be conducted without introduction of a religious element.
(New Webster's Dictionary-Deluxe Encyclopedic Edition P-869)

ترجمہ۔ "عقائد کا ایک ایسا نظام جو مذہبی ایمان و ایقان اور عبادت و اطاعت کی تمام قسموں کی تردید کرتا ہے یعنی ایسا نظریہ جسکی بنیاد پر عوامی تعلیم اور مدنی سیاست کے معاملات کا نظم مذہبی عنصر کے تعارف کے بغیر چلایا جائے۔"

مندرجہ بالا معنی کے پیش نظر اس سیکولرزم کا انتساب اگر ملک یا ریاست کی طرف ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسا ملک یا ایسی ریاست جس کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ اگر کسی معاشرے کی طرف اس لفظ کو منسوب کیا جائے تو ایسا معاشرہ مراد لیا جائے گا جہاں کے تمام معاملات و مشکلات کی عقدہ کشائی مذہب کو بالائے طاق رکھ کر ممکن ہو اور اگر اسی لفظ کا تعلق کسی تحریک یا جماعت سے جوڑ دیا جائے تو ایسی جماعت اور تحریک مراد لی جاتی ہے جس کے سامنے دین اور مذہب کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ چنانچہ سیکولر ریاست ہو تو، معاشرہ ہو تو اور تحریک و جماعت ہو تو ان تمام کا دین اور مذہب سے کوئی رشتہ نہ ہوگا۔ اور یہیں

سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ دریں صورت سیکولر ریاست کا قیام عمل میں آسکتا ہے، سیکولر معاشرے کی تشکیل ہو سکتی ہے اور سیکولر جماعت بھی بن سکتی ہے لیکن جہاں تک بات ہے مذہب اور ضابطۂ زندگی کی تو اس کی طرف سیکولرزم کا انتساب مہمل اور بے معنی ہے۔

آج اسلام کے سیکولر ہونے کی بات بہتیرے مباحث و تقاریر میں کی جاتی ہے۔ لیکن کیا اسلام واقعی سیکولرزم کا علمبردار ہے؟ اس سلسلے میں صحیح موقف کی وضاحت اسی کتاب الٰہی سے ہوتی ہے جسکے سامنے آسمان فصاحت پر کمندیں ڈالنے والوں نے بھی عاجزی و درماندگی کا ثبوت دیا اور اس کے پے در پے چیلنج پر "لَوْنَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ" (الانفال : ۳۱) کی رٹ لگاتے رہے۔

چنانچہ اسلام اور سیکولرزم پر گفتگو قرآن مقدس کی تعلیمات کی روشنی میں ہی ہوگی ——————

اس عالمِ فانی کے اندر زندگی گزارنے کے بہت سارے طریقے ہیں، بہت سارے نظریات اور بہت ساری تحریکیں ہیں، بہتیرے افکار اور بہت سارے تصورات پائے جاتے ہیں۔ مذاہب و ادیان اور افکار و نظریات کی اس دنیا میں یہ بات ذہن سے محو نہیں ہونی چاہیے کہ یہ تمام مذہب اسلام ہی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ کم از کم مذاہب و ادیان کی بنیادی تعلیمات کی یکسانیت اسکی تصدیق کرتی ہے۔ قرآن کا فرمان ہے: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ[1] ترجمہ "بلاشبہ دین تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے"۔ قرآن میں ایک اور جگہ تمام ادیان کا انکار کر کے صرف اسلام ہی کو مقصود و مطلوب دین ان الفاظ میں قرار دیا گیا ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ[2]

ترجمہ: "جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دوسرا دین چاہے گا اُس کا دین شرفِ قبولیت سے ہمکنار نہیں ہوگا"۔

مذکورہ بالا دو آیتیں اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ ادیان و مذاہب کی اس بھیڑ میں اسلام ہی وہ طریقۂ زندگی یا ضابطۂ حیات ہے جو بلا تفریق رنگ و نسل پوری انسانیت کے لیے ہے۔ یہاں کسی طرح کی جغرافیائی حد بندی نہیں ہے۔ اور قرآن نے اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً[3] کا فرمان جاری کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اسکے ساتھ کسی دوسرے نظریہ یا فکر کا لیبل لگانے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] آل عمران : ۱۹ [2] آل عمران : ۸۵ [3] البقرۃ : ۲۰۸

یہ کسی بھی ازم کا محتاج نہیں ہے خواہ کمیونزم ہو یا کیپٹلزم اور فاسزم ہو یا لیبرلزم یا پھر سیکولرزم۔ اور نہ ہی یہ ان ازموں کا علم اپنے ہاتھوں میں لے کر انسانیت کو ان کے حلقۂ بگوش ہونے کی دعوت دیتا ہے کیونکہ اسلام ایک مستقل ازم ہے، یہاں تمام شعبہ ہائے زندگی میں راہنما نقوش ملتے ہیں جنہیں اختیار کر کے پوری انسانیت رشد و ہدایت اور فوز و فلاح کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ اسکے بالمقابل دوسرے تمام ازم مخصوص طرز فکر اور مخصوص میدان میں اپنی سرگرمیاں دکھلاتے ہیں۔ انہیں ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کا سہارا لیں۔

قرآن کی مذکورہ بالا آیات کے علاوہ بھی اور بہتیری آیات ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام دین کے معاملے میں کسی طرح کی بیجا مصالحت اور سمجھوتے کا قائل نہیں ہے، بلکہ فروغ و اشاعت اور غلبہ و تمکنت کے لیے اپنے ماننے والوں کو سرگرم عمل رہنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ سورۃ الصّف کی آیت ملاحظہ فرمائیں: هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ[1] ترجمہ۔ "وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے اگرچہ مشرکوں کو یہ ناگوار معلوم ہوتا ہو"

اسلام تمام ادیان پر غلبہ و برتری کے لیے آیا ہے۔ یہ کسی دنیا پرست یا مادہ پرست مقتدر کی طرف سے اعلان نہیں ہے بلکہ اُس ذاتِ واحد کی طرف سے ایک صداقت کا اظہار ہے جس کے اشارے پر چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لیکر بڑے سے بڑا پہاڑ بھی پابند و مجبور نظر آتا ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا اس دینِ حنیف کے ساتھ تشریف آوری کا مقصد یہ بتایا گیا کہ آپ اس دین کو دوسرے تمام خود ساختہ نظام ہائے زندگی پر غالب کر دیں۔ اب چونکہ کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا اس لیے امتِ مسلمہ یا امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہی اس پیغام کی امین ہے، اسے ہی اس دین حق کو دوسروں تک پہنچانا ہے اور اس کے غلبہ کے لیے جہدِ مسلسل میں مصروف رہنا ہے۔ ہاں یہ بات فراموش نہ کی جانی چاہیے کہ اس مقدس سفر میں بہت سارے موانع و مشکلات سے سابقہ پیش آئے گا۔ آج چھوٹے سے چھوٹے حق کو حاصل کرنے کے لئے لڑائیوں سے بھی گریز نہیں کیا جاتا، ایک معاملے پر دو قسم کے خیالات ہوں

---

[1] الصّف : ۹

تو فرقہ او رجماعت کی شکل میں اپنے موافق فکر وخیال کو دوسرے فکر وخیال کے علمبرداروں پر مسلط کرنے کے لیے جنگیں بھی کی جاتی ہیں ۔ لیکن خدا کی زمین پر خدا کے دین کو نافذ کرنا یہ صرف مسلمانوں کے خدا کا حق نہیں بلکہ پوری دنیا کے خدا اور خالق کا حق ہے جسے اُن دوسرے تمام خیالات ونظریات پر مسلط ہونا ہے جو کمزوروں پر ظلم وستم کے کوڑے برساتے ہیں، جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسرے انسانوں کے حقوق کا خیال نہیں کرتے، جو اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر خدا کی زمین کو امن وسکون اور رحمت و رافت کا مسکن بنانے کی بجائے اضطراب و بے چینی، ظلم و بربریت اور کلفت وزحمت کی آماجگاہ بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصدِ عظیم کے حصول کی راہ میں بھی لڑائیاں لڑنی پڑیں گی، اگر خدا کی زمین کو امن وشانتی اور چین وسکون کا مرکز بنانا ہے تو خدا کے باغیوں، شرپسندوں اور فتنہ پروروں کو ختم کرنا ہوگا۔ کسی بھی ملک کی حکومت اپنا نظم ونسق چلانے کے لیے امن وشانتی کو محبوب رکھتی ہے اور اس کی خاطر باغیوں، سرکشوں اور شرپسندوں سے نبرد آزما رہتی ہے ——— اسی طرح پوری دنیا کی حکومت جس ہستیٔ برتر کے ہاتھ میں ہے وہ اپنی زمین پر یا اپنی حکومت میں اپنے باغیوں کو دیکھنا پسند نہیں کرتی اور وہ ان سے جنگ وجہاد کی تلقین کرتی ہے ۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ تعالےٰ سامان جنگ فراہم کرنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ قوتِ حرب اور زورِ بازو کے ذریعہ انکو مرعوب و مُنہزم کیا جاسکے ۔ فرمان ہے :

وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال : ۶۰)

ترجمہ : "اور تیار کرو ان کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر"۔

اسلام اور سیکولرزم سے متعلق اس گفتگو میں 'TOLERANCE' یا رواداری کے لفظ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جسکا مفہوم اعلیٰ ظرفی ، وسعتِ نظری اور دیگر اخلاقِ فاضلہ کو محیط ہے ۔ اس رواداری کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک ہی ملک کی دو جماعتیں یا

دو پارٹیاں ہوں۔ ان میں سے ایک پارٹی انتخابی مہم کو سر کر کے ایماندارانہ طریقے سے برسر اقتدار آجاتی ہے۔ اب یہ برسر اقتدار پارٹی اگر چاہے تو مقابلے میں آئی ہوئی دوسری شکست خوردہ پارٹی پہ طرح طرح کے مظالم ڈھا سکتی ہے، لیکن ایسا نہیں کرتی بلکہ حزب مخالف کو تمام حقوق و مراعات دیتی ہے اور وہ ذرائع و اسباب بھی فراہم کرتی ہے جو اس کے وجود و بقا کے لیے ضروری ہیں، تو برسر اقتدار حکومت کا یہ مستحسن عمل بردباری، وسعتِ ظرفی، یا رواداری کہلائے گا، سیکولر نہیں! اگر حکومت اس حسنِ سلوک کو سیکولر کہتی ہے تو یہ غلط تعبیر ہے، کیونکہ اگر یہاں پر حکومت اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہے تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ حکومت کرنے کا حق اس پارٹی کو بھی ہے جو جائز طریقے سے عوام کے ذریعہ چنی گئی ہے اور اسے بھی حق ہے جس نے انتخاب میں اپنی نااہلی کا ثبوت دیا۔

اسلام جو خدائے دوجہاں کا دیا ہوا ضابطہ ہے، وہ ابن آدم کے ساتھ حسنِ اخلاق اور رواداری کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں رواداری کے برتنے کا حکم دیا گیا ہے مخاطب اوّل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوتے کہتا ہے :-

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ۔ (النحل ، ۱۲۵)

ترجمہ ۔ "آپ اپنے رب کے راستے کی طرف (لوگوں کو) حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان کے ساتھ ایسے طریقے پر بحث کیجیے جو سب سے بہتر ہو"۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کی عملی تفسیر تھے۔ اللہ عزوجل نے آپ کو اخلاقِ فاضلہ سے نوازا تھا؛ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے ان الفاظ میں آپ کی سیرتِ طیبہ کی تصویر کھینچی تھی ، کان خلقہُ القرآن اپنے تو اپنے غیروں نے بھی آپ کو صادق، امین اور اخلاقِ عالیہ کا مجسمہ کہا تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی ۶۳ سالہ کتابِ حیات اخلاق فاضلہ کے درخشاں ابواب پر مشتمل ہے۔ دشمنوں کے ساتھ سلوک و برتاؤ کی ہزارہا مثالیں تاریخ انسانیت کی پیشانی پر ثبت ہیں بطور نمونہ طائف کا واقعہ ملاحظہ ہو۔

داعئ اعظم اس توقع کے ساتھ طائف کا سفر کرتے ہیں کہ لوگ خدا دین کو اختیار کریں گے، لیکن

سرداران طائف نہ صرف یہ کہ آپ کی باتیں نہیں سنتے بلکہ نوجوانوں کو اکساتے ہیں کہ دیکھو یہ شخص تمہارا دشمن ہے، تمہیں اپنے دین سے پھیر دینا چاہتا ہے۔ طائف کے اوباش شہہ پاکر پتھروں کی بارش کرتے ہیں، نعلینِ مبارک بھی مقدس خون سے لتھڑ جاتے ہیں۔ اس بیچارگی کے عالم میں آپکو غیبی طاقت کا سہارا ملتا ہے۔ رحمانیت جوش میں آتی ہے۔ جبرئیلِ امین سامنے آتے ہیں اور کہتے ہیں حضور! پہاڑوں کا انچارج فرشتہ حاضر ہے، حکم ہو تو دونوں پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دیا جائے تاکہ یہ درمیان میں پس کر رہ جائیں۔ لیکن زبانِ رحمت للعالمین کیا کہتی ہے! نہ، نہ ایسا نہ ہو۔ اگر یہ لوگ اپنی جہالت اور ناسمجھی کی وجہ سے خدا کے دین کو نہیں سمجھ رہے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ انکی آنے والی نسل اس دین کو سمجھے۔

رواداری اور حسن سلوک کی ایک دوسری مثال دیکھئے۔ فتح مکہ کے موقع پر خانہ کعبہ کے صحن میں دشمنان اسلام سرنگوں کھڑے ہیں۔ اور اپنی پچھلی حرکتوں کو یاد کر کے ہوش و حواس کھوئے دے رہے ہیں۔ سامنے دس ہزار خوں آشام تلواریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے کی منتظر ہیں۔ زبان وحی سے یہ ساختہ ہمکلام ہوتی ہے: "بولو! آج تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے" لوگوں کی طرف سے آواز آتی ہے: "آپ ہمارے بھائی ہیں، اس لیے آج اسی سلوک کی توقع رکھتے ہیں جو حضرت یوسفؑ نے اپنے ظالم بھائیوں کے ساتھ کیا تھا" زبانِ حق کہتی ہے: "لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ" (آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم آزاد ہو۔)

سیرتِ مقدسہ کی یہ چند کلیاں بلاشبہ رواداری اور حسنِ سلوک کی ایسی ناطق مثالیں ہیں جو تاریخی حقائق کے طور پر جانی جاتی ہے۔ پھر اس مقدس دور کے بعد بھی خلافتِ راشدہ اور بعد کے دوسرے ادوار میں غیر مسلموں کی مذہبی عبادت گاہوں کے احترام اور جان و مال کی حفاظت کے تاریخی واقعات وسعت ظرفی اور رواداری کی ناقابل انکار مثالیں ہیں، نہ کہ سیکولرزم کی۔

آج اسلام کے سیکولر ہونے کی دلیل میں قرآن پاک سے جو آیات پیش کی جاتی ہیں سب سے پہلی آیت جس سے اسلام کے سیکولر ہونے پر استشہاد کیا جاتا ہے وہ ہے سورۃ الکافرون کی آیت: لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔ "تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے" ان الفاظ

کے ذریعے یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام اور دوسرے ادیان سب برابر ہیں۔ بالخصوص جن حالات میں سورۃ الکافرون کا نزول ہوا ہے انہیں پیش نظر رکھا جائے تو اس قسم کی غلط فہمی کا ازالہ ممکن ہو سکے گا۔ اسلام کی شمع فروزاں جزیرۂ عرب میں شعاعیں بکھیرتی جا رہی ہے۔ مشرکین مکہ" بالخصوص سرداران قریش داعیٔ اعظم اور انکی دعوت کے خاتمہ کی مسلسل سازشوں میں مصروف ہیں یہ لوگ حضورؐ کو دعوتِ حق سے پھیرنے کے لیے طرح طرح کی تجویزیں لے کر آپؐ کے پاس آتے ہیں جن میں ایک تجویز یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک سال آپؐ ان کے معبودوں کی عبادت کریں اور ایک سال یہ آپ کے معبودوں کی۔ لیکن اس بیجا مصالحت کا ذرہ برابر بھی امکان نہ تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۃ القلم میں کہا گیا: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ "وہ چاہتے ہیں کہ تھوڑی سی مداہنت آپ برتیں تو وہ بھی برت لیں گے"۔ پھر یہ سورۃ نازل ہوئی۔ ترجمہ:۔" اے نبیؐ! آپ کہہ دیں کہ اے کافرو! میں اُن کی عبادت نہیں کرتا ہوں جن کی تم کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جسکی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جنکی تم نے عبادت کی ہے۔ اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو جس کی میں کرتا ہوں تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین"۔

قرآن پاک کی ان آیات میں اظہار بیزاری اور نفرت ہے اور اس کا مقصد یہی ہے کہ کفار و مشرکین سے کہہ دیا جائے کہ تم اپنا دین اپنے پاس رکھو میرے لیے تو میرا دین ہی اچھا ہے۔

اسی طرح قرآن کی ایک دوسری آیت کو بھی مستدل بنایا جاتا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[1] ترجمہ۔" دین میں کوئی زور و زبردستی نہیں ہے"۔ اگر اس آیت سے یہی تعبیر ممکن ہوتی کہ اسلام سیکولرزم کا حامی ہے تو پھر بعد میں قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ[2] کا کیا مفہوم ہوگا؟ اور رشد و غیّ کے مفہوم کا تعین کیسے ہوگا؟ اس کے علاوہ قرآن میں نبی کریمؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا: لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ[3] ترجمہ" آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں (کہ ڈنڈے کے زور سے اپنی بات منوالیں)" مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ[4] "رسولؐ پر صحیح و غلط اور حق و باطل کیا ہے، اسکی تبلیغ کے علاوہ کچھ نہیں"۔ ان آیات کے اندر ایک طرف تو داعیٔ حق کی

---

[1] [2] البقرہ: ۲۵۶ [3] الغاشیہ: ۲۲
[4] المائدہ: ۹۹

حیثیت کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف دعوتِ حق کی عظمت کا۔ یعنی یہ دعوتِ اسلام کوئی بے وزن یا بے قیمت چیز نہیں کہ زبردستی کسی پر تھوپ دی جائے۔ کسی بیش قیمت چیز کے لیے جبر و اکراہ کرنا دراصل اس کی عظمت کو گھٹانا ہے ورنہ یہاں تک بات ہے حق و ناحق اور صداقت و بطلان کی تو یہ بہرحال دو متضاد چیزیں ہیں جن کے ترک و اختیار کے نتائج بھی جدا جدا ہیں۔ ازروئے آیۂ قرآنی؛

لَا يَسْتَوِىٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ[1]

ترجمہ: "جہنم والے اور جنت والے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جنت والے ہی کامیاب و کامران ہیں۔" بایں صورت زبردستی نہ کرنے کا مفہوم سیکولرزم کیسے ہو جائے گا؟

چونکہ دعوت و تبلیغ کی راہ میں حکمت عملی ایک عظیم سرمایہ ہے اس لیے اسے اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے قرآن کا فرمان ہے؛ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ[2] "اپنے رب کی طرف آپ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ بلائیے۔" پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ طریقہ جو حکمت اور رواداری کا طریقہ ہے مخاطب کو دعوتِ حق سے قریب کرنے کے لیے ایک مؤثر حربہ ثابت ہوتا ہے یہاں تک کہ ازلی دشمن بھی جگری دوست بن جاتا ہے۔

قرآن کی ان تمام مذکورہ آیات پر سیاق و سباق کے ساتھ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کہیں تو اظہارِ بیزاری اور تنفّر مقصود ہے، کہیں دعوت کی عظمت اور داعی کی حیثیت کا اظہار ہے اور کہیں حکمت و دانائی کے ساتھ دعوت کو پیش کرنے کی تلقین ہے۔ اگر یہاں سیکولرزم مراد ہوتا تو حق و باطل کی کشمکش کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ایسی صورت میں تبلیغِ حق میں جان گھلانے کی نوبت نہ آتی۔ طائف کا واقعہ پیش نہ آتا۔ صحابہ کرام کو گرم گرم پتھروں پر لٹانے کے دردناک مناظر بھی دیکھنے میں نہ آتے۔ جنگ بدر، احد، خیبر اور تبوک وغیرہ سبھی بے معنی جنگیں ہوتیں۔ البتہ یہاں رواداری اور حسنِ سلوک کا ایک دریا موجزن نظر آتا ہے جس کی بیشمار مثالیں تاریخ کے صفحات پر موتیوں کی طرح بکھری پڑی ہیں۔

---

[1] الحشر: ۲۰

[2] النحل: ۱۲۵

لغات و اعرابِ قرآن (۵)

پروفیسر حافظ احمد یار

سُورَةُ الفَاتِحَةِ

(۳)

[ملاحظہ : کتاب میں حوالہ کے لئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس کی وضاحت مقدمہ (حکمت قرآن فروری ۸۹ء) میں کردی گئی تھی۔ جن حضرات کی نظر سے وہ شمارہ نہیں گزرا۔ ان کے لئے دوبارہ اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ [قطعہ بندی کے لئے سب سے پہلا دائیں طرف والا ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد اگلا دائیں طرف والا ہندسہ قطعہ نمبر (جو اس سورۃ میں سے زیر مطالعہ ہے) کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد تیسرا نمبر بحث اللغۃ کے لئے ۱، بحث الاعراب کے لئے ۲، الرسم کے لئے ۳ اور الضبط کے لئے ۴ لکھا گیا ہے مثلاً ۱ : ۳ : ۲ کا مطلب ہے سورۃ الفاتحہ کے تیسرے قطعہ میں بحث الاعراب]۔

۱ : ۵ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

۱ : ۵ : ۱ اللغة

۱ : ۵ : ۱ (۱) [اِهْدِ] کا مادہ "ھ د ی" اور وزن اصلی "اِفْعِلْ" ہے اور شکل اصلی "اِهْدِیْ" تھی۔

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد ھدی ..... یھدی ھُدًی (دراصل ھَدَیَ یَھْدِیُ ــ باب ضرب سے) ہمیشہ متعدی اور بغیر صلہ کے آتا ہے اور اس کے معنی

ہیں: ..... کو راستہ دکھانا، ..... کو راہ بتلانا، ..... کو راستے پر ڈالنا، ..... کو رستے چلانا ــــ عموماً تو اس سے مراد " ازراہِ لطف وکرم سیدھا راستہ دکھانا " ہی ہوتا ہے۔ البتّہ قرآن کریم میں ایک آدھ جگہ تہکماً اور طنزاً " دوزخ کا راستہ دکھانا " کے لئے آیا ہے۔

● اس فعل (ھدی یھدی) کے بعض دفعہ دو مفعول ہوتے ہیں۔ پہلا مفعول (جسے راستہ دکھایا گیا) تو ہمیشہ بغیر صلہ کے (مفعول بنفسہٖ) آتا ہے مگر دوسرا مفعول (یعنی جدھر یا جو راستہ دکھایا گیا) بغیر صلہ کے بھی اور کبھی لام (لِ) اور کبھی " اِلٰی " کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے یعنی " اس نے اسے راستہ دکھایا " کا عربی میں ترجمہ تین طرح ہو سکتا ہے (۱) ھداہ الصراطَ (۲) ھداہ لِلصراط اور (۳) ھداہ الی الصراط۔ (صراط = راستہ) ــ قرآن کریم میں اس فعل کے استعمال کی یہ تینوں صورتیں آئی ہیں۔

بعض اہلِ لغت پہلی صورت (بغیر صلہ والی) کو لغتِ اہلِ حجاز کہتے ہیں اور دوسری دو (صلہ والی) کو حجاز سے باہر کی بولی سمجھتے ہیں ــ (حجاز یا الحجاز = عرب کا وہ مغربی جغرافیائی خطہ جس میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ واقع ہیں)۔

● لفظ " اِھدِ " دراصل " اِھدِیْ " تھا یعنی فعل ثلاثی مجرد سے صیغہ امر واحد مخاطب مذکر۔ عرب لوگ کسی ناقص مادہ سے فعل ثلاثی مجرد مجزوم کے ضمہ (ـُـ) پر ختم ہونے والے مضارع کے پانچ صیغوں میں آخر پر آنے والی " و " یا " ی " کو تلفظ سے ساقط کر دیتے ہیں۔ بلکہ اسے لکھتے بھی نہیں ــــ اسے ہی " صرفی تعلیل " کہتے ہیں۔ مثلاً اسی فعل سے فعل مضارع منفی بلَمْ " لَمْ یَھْدِ " رہ جائے گا اور فعل امر " اِھْدِ " رہ جاتا ہے جس کی گردان " اِھْدِ، اِھْدِیَا، اِھْدُوا، اِھْدِیْ اِھْدِیَا اور اِھْدِیْنَ " ہوگی۔ ان تمام صیغوں کے شروع کا الف ھمزۃ الوصل ہے جو اس صیغہ کے اپنے سے ماقبل کسی کلمہ (اسم فعل یا حرف) کے ساتھ ملا کر پڑھنے کی صورت میں تلفظ سے گر جاتا ہے (اگرچہ

لکھا جاتا ہے)[1] "ھدی" قرآن کریم کا ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے۔ اس سے اسماء و افعال کے تین سو سے زیادہ صیغے قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں۔

۱:۵:۱ (۲) [نَا] یہ جمع متکلم (مذکر و مؤنث ہر دو) کے لئے ضمیر منصوب اور مجرور (ہر دو) کی صورت ہے۔ بصورت منصوب ترجمہ "ہم کو" یا ہمیں (us) ہوگا اور مجرور ہو تو اس کا ترجمہ "ہمارا" (our) کیا جائے گا۔ اسی ضمیر کی مرفوع صورت "نَحْنُ" (بمعنی "ہم" یا we) استعمال ہوتی ہے۔

۱:۵:۱ (۳) [الصِّرَاطَ] اس لفظ کا مادہ "ص ر ط" اور وزن "فِعَالٌ" ہے اور یہ اس کی معرف باللام (منصوب) صورت ہے۔ اس مادہ (ص ر ط) سے کسی طرح کا کوئی فعل استعمال نہیں ہوتا۔ البتہ مادہ "س ر ط" سے فعل ثلاثی مجرد سَرِطَ ..... یسرَطُ سَرَطاناً (باب نصر اور سمع سے) بمعنی: "..... کو نگل جانا" استعمال ہوتا ہے۔ اور اس سے بھی لفظ "سِراط" (بمعنی راستہ) آتا ہے جو ہر لحاظ سے "صراط" کا ہم معنی ہے ـــــ بلکہ ان ہی معنوں میں ایک تیسرا لفظ "زراط" بھی آتا ہے۔ تاہم اہلِ زبان "صراط" کو ہی بلحاظ استعمال زیادہ فصیح اور قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں۔ یہی قریش کی بولی تھی۔ اور قرآن کریم میں بھی یہی صورت استعمال ہوئی ہے[2] تاہم قراء حضرات کے ہاں ان تینوں الفاظ (صراط، سراط اور زراط) کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے۔ اگرچہ "رسمِ قرآن" فنِ قراءت کے ان احتمالات میں سے کسی کا متحمل نہیں ہو سکتا[3]

---

[1] ہدایت کے مختلف طریقے یا "اقسام ہدایت" نیز کسی خاص عبارت میں ہدایت کے مختلف معنی ہائے مراد (مثلاً صرف راہ دکھانا یا منزل پر پہنچا دینا وغیرہ) کی تفصیل کے لئے کسی اچھی تفسیر کی طرف رجوع کیا جائے یا مثلاً دیکھئے مفرداتِ راغب مادہ "ھدی" یا قاموس قرآنی ج ۳ ص ۱۴۵۔

[2] ترجیح صاد کے بیان کے لئے دیکھئے الکشاف (طبع البابی) ج ۱ ص ۶۳

[3] جسے قراءت کی کسی کتاب میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اور دراصل تو یہ کسی ماہر قاری سے سننے کی چیز ہے۔

● لفظ " صراط " کے معنی راستہ یا سڑک کے ہیں اور یہ زیادہ تر نمایاں اور معروف وممتاز راستے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اہلِ لغت صراط (جس کی اصل "سراط" ہے مگر " ط " کی مناسبت سے " س " کو " ص " پڑھا اور بولا جاتا ہے) کی " وجہ تسمیہ " بھی یہی بیان کرتے ہیں کہ راستے میں مسافر اس طرح آگے چلا جاتا ہے جیسے نگلی ہوئی چیز پیٹ (اور انتڑیوں) میں گم ہو جاتی ہے ۔ واللہ اعلم ۔ لفظ "صراط" قرآن کریم میں ـــ مفرد یا مرکّب (توصیفی یا اضافی) شکل میں ـــــ پینتالیس (۴۵) دفعہ وارد ہوا ہے ۔

۱:۵:۱ (۴) [الْمُسْتَقِيمَ] اس کا مادہ " ق و م " اور وزن اصلی " مُسْتَفْعِلٌ " ہے ۔ اور شکل اصلی " مُسْتَقْوِمٌ " تھی ۔

● اس مادہ (ق و م) سے فعل ثلاثی مجرد قَامَ یَقُوْمُ قِیَامًا (دراصل قَوَمَ یَقْوُمُ) باب نصر سے آتا ہے اور اس کے معنی " کھڑا ہونا " ، " کھڑا رہنا " ، یا " کھڑا ہو جانا " ہوتے ہیں ۔ یہ فعل بغیر صلہ کے تو ہمیشہ لازم ہوتا ہے مگر مختلف صلات (مثلاً " عَلٰی " ، " لِ " ، " بِ ") کے ساتھ کبھی لازم کبھی متعدی (دونوں طرح) مستعمل ہے ۔ اس مادہ سے مزید فیہ کے بھی متعدد ابواب مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتے ہیں ۔ تاہم قرآن کریم میں یہ مادہ مزید فیہ کے صرف باب اِفعال اور بابِ استفعال سے استعمال ہوا ہے ۔

● یہ لفظ (المستقیم) باب استفعال سے اسم الفاعل کا (معرف باللام) صیغہ ہے ۔ جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہے اس کی "شکل اصلی" مُسْتَقْوِمٌ تھی مگر اہلِ عرب کی زبان پر اس قسم کے الفاظ کی اصلی شکل کا تلفظ گراں گزرتا ہے وہ اسے بدل کر بولتے ہیں ۔ مگر اس قسم کے بہت سے الفاظ کی تبدیلی کو سامنے رکھتے ہوئے علماء صَرف نے یہ قاعدہ مستنبط کیا کہ اس میں " واو " کی حرکت (ـِـ) ماقبل ساکن (ق) کو دے کر خود " واو " کو اب اپنی ماقبل کی (نئی) حرکت (ـِـ) کے موافق حرف " ی " میں بدل دیا جاتا ہے " ـــــ اس طرح تعلیل کے بعد اس کی (استعمالی) شکل

" مستقیم " اور وزن " مُسْتَفِیل " رہ گیا ہے ۔ [ابھی پچھلی آیت میں آپ نے لفظ " نستعین " میں بھی اسی قسم کی صرفی تعلیل ملاحظہ کی ہے] اس مادہ سے باب استفعال کے فعل [اِستقام یستقیم استقامۃ] کے معنی ہیں : " درست ہونا " ، " سیدھا ہونا " ، " اعتدال پر ہونا " ، " سیدھے ہی چلے جانا (کہیں مڑے بغیر) " ۔ اس طرح مستقیم کے لفظی معنی " سیدھا ہونے والا " ، " مڑے بغیر سیدھا ہی جانے والا " ہیں اور اسی لئے اکثر مترجمین حسبِ موقع اس کا ترجمہ " سیدھا یا سیدھی " ہی سے کرتے ہیں ۔

● یہ مادہ (ق و م) ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے ۔ صرف قرآن کریم میں ہی اس مادہ سے مشتق اسماء و افعال کے ساڑھے چھ سو (۶۵۰) کے قریب صیغے وارد ہوئے ہیں ۔ جس میں صرف فعل ثلاثی مجرد کے تیس سے زائد صیغے اور لفظ " مستقیم " سینتیس (۳۷) دفعہ آیا ہے ۔

۱:۵:۲ الاعراب

[اِهْدِ] فعل امر معروف کا صیغہ واحد مخاطب مذکر (بمعنی دعا) ہے[1] جس میں ضمیر فاعل " اَنْتَ " مستتر ہے جس کا ترجمہ ہوگا تو چلا ، دکھا ، بتلا وغیرہ ۔ [نا] ضمیر متصل منصوب ہے جو فعل " اِهْدِ " کا مفعول بہ (اوّل) ہے ۔ یعنی " ہم کو یا ہمیں " ۔ [الصراطَ] مفعول بہ ثانی ہے (یہاں یہ بغیر صلہ کے آیا ہے) اور اسی لئے منصوب ہے اور علامتِ نصب " ط " کی فتحہ (ـَ) ہے[2]

---

[1] صیغۂ امر ہمیشہ صرف " حکم دینا " کے لئے نہیں آتا بلکہ متعدد معنوی اغراض (مثلاً حکم ، اجازت ، طلب ، دعا ، دھمکی وغیرہ) کے لئے آتا ہے جن کی تعداد اٹھارہ تک پہنچتی ہے ۔ تفصیل اصولِ فقہ کی کسی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے مثلاً دوالیبی (المدخل) ص ۱۶۲ ۔

[2] جب کوئی فعل صلہ کے بغیر بھی اور صلہ کے ساتھ بھی اسی معنی کے لئے استعمال ہوتا ہو تو جب وہ بغیر صلہ کے آئے تو نحوی اس کے مفعول کو " منصوب بنزع الخافض " یعنی الخافض (= الجارّ) ہٹا کر منصوب کیا ہوا کہتے ہیں ۔ مثلاً یہاں " الصراط " کو منصوب بنزع الخافض کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ فعل " ھدی " کا دوسرا مفعول " الی " یا (باقی اگلے صفحہ پر)

[**المستقیم**] لفظ " الصراط "، کی صفت ہونے کے باعث منصوب ہے۔ اور علامتِ نصب " م "، کی فتحہ (ـَ) ہے۔ اس طرح پورے مرکّبِ توصیفی کا اردو ترجمہ ہوگا " سیدھا راستہ یا سیدھی راہ "۔ یوں پوری آیت فعل مع فاعل اور مفعول مل کر پورا جملہ فعلیہ ہے۔

۱:۵:۳ الرسم

[**اھدنا**] کا رسم املائی اور رسم قرآنی یکساں ہے۔ البتہ اس کے متعلق چند امور توجہ طلب ہیں جن کا تعلق دراصل قراءت سے ہے۔ مگر قراءت کا تعلق چونکہ " رسم " اور " ضبط " دونوں سے ہوتا ہے، اس لئے ان کو یہاں بیان کر دینا مناسب ہے :-

- " اھدنا " کے شروع کا " الف " ھمزۃ الوصل ہے[۱] جو اپنے سے ماقبل کے ساتھ وصل کی صورت میں تلفّظ سے ساقط ہو جاتا ہے مثلاً سورۃ الفاتحہ میں اگر " نستعین " پر وقف نہ کیا جائے (جیسا کہ بعض دفعہ قاری حضرات نہیں کرتے) تو اس کے آخری " نُ " کو " اھدنا " کی " ھ " کے ساتھ ملا کر پڑھ سکتے ہیں یعنی " نُہْ " کی طرح۔
- " نَا "، کا آخری الف " اصل الف " ہے اسے ھمزہ نہیں کہیں گے۔ کیونکہ اس پر کوئی حرکت نہیں آتی اور یہ صرف اپنے مفتوح ماقبل (جو یہاں " نَ " ہے) کے

(تسلسل) " لِ " کے صلہ کے ساتھ بھی آسکتا ہے ۔ اور اگر مفعول سے پہلے کوئی صلہ ہو جس سے مفعول (عملاً) مجرور ہو جاتا ہے تو اس وقت اسے محلاً منصوب کہتے ہیں۔ مزید بحث کے لئے چاہیں تو دیکھئے اعراب القرآن للدرویش ج ۱ ص ۱۵ یا تجدید النحو ص ۶۹-۱۶۸۔

[۱] دراصل ھمزہ (وصل کا ہو یا قطع کا) کو " الف " کہنا ہی درست نہیں ہے۔ تاہم اردو میں چونکہ " ا " کو الف ہی کہتے ہیں اس لئے آسانی اور عرف کے پیشِ نظر ہم نے بھی اسے الف کہہ دیا ہے اور آئندہ بھی ہم یہ " لائسنس " استعمال کر لیا کریں گے ورنہ " ا " دراصل تو " ھمزہ " کی کتابت کی کئی صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔

اپنے مابعد (ساکن) کے ساتھ وصل کی صورت میں تلفظ سے ساقط ہوجاتا ہے جیسے یہاں " نَا " کے " نَ " کو آگے " الصّراط " کے " ص " کے ساتھ ملاتے وقت " نَصْ " پڑھتے ہیں۔

● لفظ " الصراط " کا ابتدائی " الف " بھی (لام تعریف کا) همزۃ الوصل ہے[1]۔ اور " ص " کے شمسی حرف ہونے کی بنا پر " لام " خاموش (SILENT) ہوجاتا ہے اور " نَا " کا " ن " صراط کے " ص " میں مدغم کرکے (ملاکر) پڑھا جاتا ہے جس سے تشدید پیدا ہوتی ہے (" نَصّ ")۔

[**الصراط**] کے رسم قرآنی کے بارے میں حسب ذیل امور قابل توجہ ہیں:-

● یہ لفظ (صراط) قرآن کریم میں جہاں اور جس طرح (معرفہ نکرہ و مفرد مرکب وغیرہ) بھی آیا ہے اسے ہمیشہ " ص " کے ساتھ لکھنا رسم عثمانی کا متفق علیہ مسئلہ ہے یعنی اسے اس کی (بلحاظ مادہ اصلی یا بلحاظ تلفظ دوسری شکل مثلاً " سراط " یا " زراط " لکھنا ممنوع ہے۔ اگرچہ قراء حضرات کی فنی بازیگری سے یہ بھی محفوظ نہیں رہا۔

● اس لفظ (الصراط) کا درمیانی الف تلفظ میں تو یقیناً آتا ہے۔ یعنی اسے " رَا " ہی پڑھتے ہیں۔ مگر رسم عثمانی میں متعدد کلمات کے اندر آنے والے الف کو کتابت میں حذف کر دیا جاتا ہے (جس کی دو مثالیں " الرحمٰن " اور " مٰلكِ " میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ اور قرآن مجید کے رسم میں اس کی بیسیوں مثالیں آگے آئیں گی)۔

● خیال رہے کہ کسی کلمہ کی ابتداء میں آنے والا " الف " دراصل همزہ ہی ہوتا ہے چاہے قطع کا ہو یا وصل کا۔ اور کسی کلمہ کے آخر پر آنے والا " الف "، کتابت میں کبھی محذوف نہیں ہوتا۔ البتہ کسی کلمہ کے درمیان واقع ہونے والے " الف " یا " الفات " کا کتابت میں حذف (نہ لکھنا) یا اثبات (لکھنا) علم الرسم کے اہم مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے بلکہ عموماً کتب رسم کی ابتداء ہی " حذف الف " والے

---

[1] حاشیہ صفحہ گذشتہ دیکھئے۔

کلمات کے بیان سے ہوتی ہے۔ اس قسم کے کلمات میں سے ایک یہ " الصراط" بھی ہے۔

● تاہم اس لفظ (الصراط) کے اس درمیانی " الف" کے حذف یا اثبات میں اختلاف ہے۔ غالباً مصاحف عثمانیہ میں (جو علم الرسم کی اصل ہیں) سے بعض میں یہ باثبات الف مکتوب تھا اور بعض میں بحذفِ الف لکھا گیا تھا۔ [اگرچہ اس لفظ کے بارے میں عثمانی مصاحف میں اس اختلاف کی تصریح نہیں ملتی جیسا کہ بعض دوسرے کلمات کے بارے میں اس قسم کی صراحت ملتی ہے کہ " وہ" عراقی مصحف میں یوں اور شامی مصحف میں یوں لکھا گیا تھا] ۔ بہرحال اس وقت (اور کئی صدیوں سے) تمام غیر عرب مشرقی ممالک (ترکی، ایران، برصغیر، چین وغیرہ) میں اسے باثبات الف ہی لکھا جاتا ہے۔ جب کہ بیشتر عرب ممالک (مثلاً مصر، شام، سعودیہ وغیرہ) اور ماسوائے لیبیا باقی تمام افریقی ملکوں (تونس، مراکش، غانا، نائیجیریا، سوڈان، وغیرہ) میں یہ بحذف الف لکھا جاتا ہے۔

● تاہم مشارقہ (اہلِ مشرق) اور مغاربہ (اہلِ مغرب[1]) کے تعامل میں اس فرق کی وجہ مختلف ہے۔ اہلِ مشرق نے تو غالباً ازراہِ تساہل عام عربی املاء پر قیاس کرتے ہوئے اسے " صراط" (باثبات الف) لکھنا شروع کر دیا۔ بہرحال اہلِ مشرق کے اس تعامل (باثباتِ الف) کی کوئی صریح وجہ کہیں بیان نہیں ہوئی۔ مگر لیبیا والے جو اسے باثبات الف لکھتے ہیں تو ان کے پاس اس کی ایک معقول فنّی وجہ ہے۔ اور بحذف الف لکھنے والوں کے پاس بھی ایک دلیل موجود ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے:-

● علم الرسم کی دو بنیادی اور مستند کتابیں (حدیث میں بخاری اور مسلم کی طرح) ایسی ہیں جو اپنے سے پیشتر کی تمام کتابوں کی جامع اور اپنے بعد آنے والی تمام کتابوں کی بنیاد ہیں۔ اور یہ ہیں (۱) عثمان بن سعید الدانی الاندلسی (ت ۴۴۴ھ) کی " المقنع " اور (۲) اس کے

---

[1] خیال رہے کہ اسلامی تاریخ کی اصطلاح میں مغرب سے مراد مصر سے مغرب کی طرف کے تمام افریقی ملک ہوتے ہیں جن میں تو مرحوم" اندلس بھی شامل تھا ۔۔۔ یورپ اور امریکہ مراد نہیں ہوتے۔

شاگرد ابوداؤد سلیمان بن نجاح الاندلسی (ت ۴۹۶ھ) کی " التنزیل فی هجاء المصاحف " علم الرسم پر بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کی بنیاد یہی دو کتابیں ہیں اور بعد والے تمام مصنف ان دو کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ اب قصہ یوں ہے کہ المقنع للدانی میں ـــــ بلکہ علم الرسم پر ایک دوسری اہم کتاب " العقیلہ " میں (جسے الرائیۃ للشاطبی بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ ایک منظوم کتاب ہے اور رائیہ قصیدہ کی صورت میں ہے) ان دونوں کتابوں میں اس لفظ (صراط) کے حذف الف کی کہیں تصریح نہیں کی گئی ـــــ اور یہ اصول ہے کہ جب کسی جگہ حذف کی تصریح نہ ہو تو پھر اس لفظ کی کتابت میں عام عربی املاء (رسم معتاد) کو ہی اختیار کیا جائے گا۔ بلکہ الدانی نے ایک عام اصول یہ بیان کیا ہے کہ قرآن کریم میں "فِعَال" اور " فَعَال" کے وزن پر آنے والے تمام کلمات باثبات الف لکھے جاتے ہیں اس میں یہ لفظ " صراط " خود بخود آجاتا ہے ـــــ اس کے برعکس ابوداؤد (سلیمان بن نجاح) نے اپنی کتاب میں لفظ " صراط " کے محذوف الالف ہونے کی صراحت کی ہے۔ گویا اس لفظ کے بارے میں " الدانی " اور " ابوداؤد " میں اختلاف ہے۔

● کسی کلمہ کے رسم کے بارے میں ان دونوں کے اختلاف کی صورت میں عرب اور عام افرقی ممالک میں ابوداؤد کے قول کو ترجیح دی جاتی ہے[1] اس لئے ان ممالک میں لفظ " صراط " میں الف کا حذف ابوداؤد کی تصریح یا ترجیح کے ذکر کی بنا پر اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی اسے صرف " صرط " لکھا جاتا ہے پھر بذریعہ ضبط الف کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے مقابلے پر اہل لیبیا کے ہاں یہ اصول ہے کہ الدانی اور ابوداؤد میں اختلاف کی صورت میں شاگرد (ابوداؤد) کی بجائے استاد (الدانی) کے قول کو ترجیح دی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ لیبیا کے " مصحف الجماهیریہ " میں اس لفظ کو "صراط" (باثبات الف) لکھا گیا ہے[2] بلحاظ رسم اس قسم کے مختلف فیہ مزید کلمات آگے چل

---

[1] دیکھئے مصری یا سعودی یا شامی مصحف کے آخر پر ضمیمہ " التعریف بهذا المصحف "

[2] دیکھئے " مصحف الجماهیریہ " کے آخر پر ضمیمۃ التعریف بالمصحف۔ نیز نثر المرجان ج ۱ ص ۹۷

کر سامنے آئیں گے۔[1]

● اس اختلاف سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اس لفظ "صراط" کی کتابت میں "اثبات الف" کو حتمی طور پر رسم عثمانی کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا جا سکتا جیسا کہ عرب اور افریقی ممالک میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ مدینہ یونیورسٹی کے دو اساتذہ نے پاکستانی مصاحف کی اغلاط پر اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ بہر حال یہ لفظ "صراط" قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی آیا ہے (اور ابھی بیان ہو چکا ہے کہ یہ لفظ قرآن کریم میں پینتالیس (۴۵) دفعہ آیا ہے) سب جگہ یکساں طریقے پر لکھا جائے گا۔ یعنی یا تو سب جگہ بحذف الف یا ہر جگہ باثبات الف لکھا جائے گا ــــ کہیں بحذف اور کہیں باثبات لکھنا جائز نہیں ہے۔

● اہل مشرق اور اہل لیبیا اس لفظ (صراط) کی باثبات الف کتابت سے اتنے مانوس ہو چکے ہیں کہ انہیں مصری یا سعودی یا ساسی مصاحف میں (اور ان کے تتبع میں لکھے گئے پاکستانی "تجویدی قرآن" میں) یہاں بحذف الف کتابت (صرط) عجیب

---

[1] یہاں ایک دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ الدانی کی کتاب تو شائع ہو چکی ہے مگر ابو داؤد کی "التنزیل" ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوئی اس کا ایک آدھ قلمی نسخہ کہیں کہیں موجود ہے۔ مصر والوں نے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے جب "نسخۂ امیریہ" شائع کیا تو اس میں یہ کہا گیا تھا کہ مسائل رسم میں اختلاف کی صورت میں الدانی کی بجائے ابو داؤد کے قول کو ترجیح دی گئی ہے۔ غالباً مصر میں تو اس کا کوئی قلمی نسخہ موجود ہوگا۔ مگر سعودیہ والوں نے بھی اپنے مصحف کے آخر پر یہی بات (غالباً مصریوں کی نقل میں) لکھ دی۔ حالانکہ مدینہ یونیورسٹی میں کم از کم مارچ ۱۹۸۹ء کے آخر تک بھی ابو داؤد کی کتاب کی فوٹو سٹیٹ یا مائیکرو فلم تک نہیں تھی۔ اب وہ مکتبہ ظاہریہ دمشق سے منگوا رہے تھے ــــ دراصل ان کا ذریعہ معلومات مورد الظمآن وغیرہ بعد کی تصانیف ہیں جو ابو داؤد کا قول نقل کرتے ہیں ــــ پھر اصل مصنف کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی جس کی کتاب کی شکل تک نہیں دیکھی۔

لگتی ہے۔ دوسری طرف چونکہ اس لفظ کی عام عربی املاء بھی باثبات الف ہے اس لئے عرب ممالک کے پڑھے لکھے لوگوں کو اس کا رسم عثمانی (بحذف الف) عجیب لگتا ہے۔ بہرحال اصل چیز متفق علیہ رسم عثمانی کی پابندی ہے چاہے وہ مانوس لگے یا اجنبی۔ کسی غلطی کی تکرار کی بناپر اس سے مانوس ہو جانے کی وجہ سے اسے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۱:۵:۴ الضبط

اس آیت (اھدنا الصراط المستقیم) میں اختلافِ ضبط کی درج ذیل صورتیں موجود ہیں:۔

۱۔ ھمزۃ الوصل کی علامت ڈالنا یا نہ ڈالنا۔ پہلے (بسم اللہ کی بحث میں) بیان ہو چکا ہے کہ یہ علامت صرف عرب اور افریقی ممالک میں مختلف شکلوں (آ، اٗ، اٖ، اٗ وغیرہ) میں لکھی جاتی ہے۔ افریقی ممالک میں ھمزۃ الوصل پر علامت الوصل کے علاوہ اس کے ماقبل کی حرکت کی علامت بھی ڈالتے ہیں۔ دیکھئے حکمتِ قرآن ماہ جون ۸۹ء صہ ۵۶۔ آیت زیرِ مطالعہ کے تینوں کلمات کی ابتداء ھمزۃ الوصل سے ہوئی ہے۔

۲۔ حذف الف کی علامت کا اختلاف۔ عرب اور افریقی ملکوں میں اسے فتحہ مع الف صغیرہ (ـَا) سے اور باقی ملکوں میں صرف کھڑی زبر (ـٰ) سے ظاہر کرتے ہیں۔ اس اختلاف کا اثر کلمہ "الصراط" کے ضبط میں ظاہر ہوگا (بحذف الف لکھنے کی صورت میں)

۳۔ یائے ساکنہ ماقبل مکسور پر علامت سکون اور ماقبل کی حرکت کے لئے علامت کا فرق۔ یہ علامتِ سکون صرف برصغیر میں ڈالی جاتی ہے اور ماقبل کی حرکت ہر جگہ کسرہ (ـِ) ڈالی جاتی ہے مگر ایران اور ترکی میں اسے کھڑی زیر (ـٖ) کی شکل میں لکھتے ہیں یہ فرق "المستقیم" میں ظاہر ہوگا۔

۴۔ الف ماقبل مفتوح میں ماقبل پر ہر جگہ فتحہ (ـَ) ڈالتے ہیں مگر ایران میں یہ بھی

کتب نحو میں پڑھ چکا ہوتا ہے۔ [بعض ڈکشنریوں مثلاً المنجد میں " الذی " اور اس کے ساتھی اسماء موصولہ کا ذکر " الذ " کی ترتیب میں کیا گیا ہے] اگرچہ ہم اس مفروضہ پر چل رہے ہیں کہ آپ اسماء موصولہ کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ تاہم محض اعادہ اور یاد دہانی کے لئے یہاں ان کے بارے میں ذرا وضاحت کی جاتی ہے۔

● اسماء موصولہ کی کثیر الاستعمال شکلیں حسب ذیل ہیں :—

۱ واحد مذکر کے لئے " اَلَّذِیْ " جو مبنی ہے اور اس کے معنی حسب موقع "جو کہ" "جس نے کہ" ، " جس کو کہ " اور " جس کا کہ " کر لئے جاتے ہیں۔

۲ تثنیہ مذکر کے لئے " اللّذانِ " جس کی نصبی اور جری صورت " اللَّذَیْنِ " ہوتی ہے اور معنی " وہ دو جو کہ، جن کو کہ یا جن کا کہ " ہوں گے۔

۳ جمع مذکر کے لئے " اَلَّذِیْنَ " جو مبنی ہے اور اس کے معنی بھی ۱ کی طرح بصیغہ جمع (وہ جنہوں نے، جن کو، جن کا) لئے جاتے ہیں۔

۴ واحد مؤنث کے لئے " اَلَّتِیْ " جو مبنی ہے اور اس کے معنی بھی ۱ کی طرح حسب موقع بصیغۂ واحد مؤنث لئے جاتے ہیں۔

۵ تثنیہ مؤنث کے لئے " اللَّتانِ " جس کی نصبی یا جری شکل " اللَّتَیْنِ " ہوگی اور معنی میں " وہ دو مؤنث جو کہ " کا مفہوم ہوگا۔

۶ جمع مؤنث کے لئے " اللَّاتی " یا " اللَّائِیْ " (دو صورتیں) جو دونوں ہی مبنی ہیں اور اس کے معنی ۳ کی طرح بصیغہ مؤنث (مثلاً "وہ سب عورتیں جو کہ" کی طرح) ہوں گے۔ ایک نقشہ کی شکل میں ان سب کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

		رفع	نصب	جر
مذکر	واحد	اَلَّذِیْ	الذی	الذی
	تثنیہ	اَلَّذَانِ	اللَّذَیْنِ	اللَّذَیْنِ
	جمع	اَلَّذِیْنَ	اَلَّذِیْنَ	اَلَّذِیْنَ

مؤنث	واحد	الّتی	الّتی	الّتی
	تثنیہ	اللّتانِ	اللتَینِ	اللتَینِ
	جمع	اللاتی	اللاتی	اللاتی
	ر	اللائی	اللائی	اللائی

● ان کے علاوہ اسم موصول کی تین اور صورتیں بھی کثیر الاستعمال ہیں۔ یعنی مَنْ (جو کہ، جس نے کہ، جس کو کہ، جس کا کہ) مَا (جو کچھ کہ وغیرہ) اور اَیٌّ (جونسا، کونسا وغیرہ)۔ ان تمام اسماء موصولہ کے قواعدِ استعمال کے اعادہ کے لئے کتبِ نحو کی طرف رجوع کرنا چاہیئے [1]۔

● اسماء موصولہ کی مذکورہ بالا (بصورتِ نقشہ) صورتوں میں سے صرف ۲ (اللتان یا اللتین) قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوئی باقی تمام صورتیں استعمال ہوئی ہیں۔ ان سب کا بیان اپنی اپنی جگہ ہوگا۔

● اسماء موصولہ کی پہلی "چھ" شکلوں کی املاء کو غور سے دیکھئے۔ واحد مذکر، واحد مؤنث اور جمع مذکر میں "لام" (ل) ایک دفعہ لکھا جاتا ہے۔ (الذی، التی اور الذین)۔ مگر تثنیہ مذکر، تثنیہ مؤنث اور جمع مؤنث میں "لام" دو دفعہ لکھا جاتا ہے۔ (اللذانِ، اللتان، اللاتی وغیرہ)۔ تاہم خیال رہے کہ یہ عام عربی قیاسی املاء (رسم معتاد) ہے، قرآن کریم میں ان اسماء (موصولہ) کے لکھنے کے اپنے خاص طریقے ہیں جو اپنی اپنی جگہ "الرسم" کے عنوان کے تحت مذکور ہوں گے (ان شاء اللہ تعالیٰ)

۱:۶:۱ (۲) [اَنْعَمْتَ] کا مادہ "ن ع م" اور وزن "اَفْعَلْتَ" ہے اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد نَعِمَ ینعَمُ نِعْمَۃً (باب نصر، سمع اور فتح سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں۔ "خوشحال ہونا"، "مالا مال ہونا" "تازہ اور سرسبز ہونا"۔ اور نَعُمَ ینعُمُ نُعُومَۃً (باب کرم سے) کے معنی "نرم و نازک ہونا"، ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ فعل ہمیشہ لازم اور بغیر صلہ کے آتا ہے۔ قرآن کریم میں اس مادہ سے ثلاثی مجرد کوئی فعل نہیں آیا۔ البتہ ثلاثی مجرد کا مصدر "نِعمۃ" مزید فیہ کے دو ابواب (اِفعال اور تفعیل) سے اَفعال کے کچھ صیغے اور اس مادہ (نعم) سے مشتق اور ماخوذ متعدد

[1] مثلاً معجم النحو ص ۳۸۰ ببعد یا تجدید النحو ص ۱۸-۱۱۷

اسماء قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔

● لفظ " اَنْعَمْتَ " اس مادہ سے باب اِفعال کا فعل ماضی معروف کا صیغہ واحد مذکر مخاطب ہے۔ باب افعال کے اس فعل اَنْعَمَ ..... یُنْعِمُ انعاماً کے معنی ہیں "... کو نعمت دینا، ...... پر انعام کرنا"۔ یہ فعل ہمیشہ متعدی آتا ہے اور اس کے لئے عموماً دو مفعول درکار ہوتے ہیں (۱) جس کو انعام دیا جائے اور (۲) جو چیز انعام کے طور پر دی جائے۔ ان میں سے پہلے مفعول کے لئے یہ فعل ہمیشہ " علی " کے صلہ کے ساتھ آتا ہے اور اس مفعول (اوّل) کو " مُنعَم علیہ " کہتے ہیں۔ دوسرا مفعول، اگر مذکور ہو تو یہ صلہ کے بغیر (مفعول بنفسہ ہو کر) بھی اور باء (بِ) کے ساتھ بھی آتا ہے۔ اور اس (چیز کو جو بطور انعام دی جائے) کو " مُنعَم بہ " کہیں گے مثلاً آپ عربی میں یوں کہیں گے: اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْہِ الشَّیْءَ یا بِالشَّیْءِ (اللہ نے اس کو (فلاں) چیز انعام دی) ــــ قرآن کریم میں اس فعل کے ساتھ باء (بِ) کے صلہ کا استعمال تو کہیں نہیں ہوا۔ مفعول بنفسہ کی بھی مثال صرف ایک جگہ (الانفال : ۵۳) آئی ہے ــــ اس کا بیان اپنی جگہ آئے گا۔ ــــ البتہ " علی " کے صلہ کے ساتھ (صرف مفعول اوّل ــ منعم علیہ ــ کا ذکر کرتے ہوئے) اس فعل (اِنعام) سے سترہ مختلف صیغے قرآن کریم میں آئے ہیں ــــ

۱:۶:۱ (۳) [عَلَيْهِمْ] یہ دراصل " عَلٰی " (حرف الجر) اور " هُمْ " (ضمیر مجرور متصل) سے مرکب ہے۔ " عَلٰی " جب کسی ضمیر سے پہلے آئے تو اُسے عموماً " عَلَیْ " پڑھا جاتا ہے اور ضمیر مجرور " هُمْ " سے پہلے اگر کوئی مکسور حرف یا ساکن یاء (یْ) آئے تو عموماً اسے " هِمْ " پڑھتے ہیں ــــ اور یہی قاعدہ " هُما " اور " هُنَّ " میں بھی جاری ہوتا ہے یعنی علیہِم، علیہِما، علیہِنَّ پڑھے جاتے ہیں۔ اس قاعدے کا تعلق صرف عربوں کے طریق تلفظ سے ہے اور اس کا عملاً اطلاق فن قراءۃ اور تجوید میں ہوتا ہے[1]۔ یہ کسی لغوی، اشتقاقی یا نحوی (اعراب وغیرہ کے)

---

[1] اور فن قراءت میں اس (علیہم) کے پڑھنے کے بعض دیگر طریقوں (قراءات) سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ مثلاً " علیہُمْ " اور " عَلَیْہِمُوْ " وغیرہ۔ کیونکہ بعض عرب اس طرح بھی بولتے ہیں۔ مزید وضاحت کے لئے چاہیں تو دیکھئے البیان (ابن الانباری) ج ا ص ۴۰ - ۳۹ یا قراءات کی کوئی کتاب۔

قاعدے پر مبنی نہیں ہے ۔

● اس حرف جار (علی) کے متعدد معنی اور استعمالات ہیں ۔ ان میں سے زیادہ مستعمل صورتوں کا اردو ترجمہ حسب موقع "پر"، "کے اوپر"، "کے باوجود"، "کے موقع پر"، "کے خلاف" کے ساتھ کر لیا جاتا ہے ۔ اس کی مختلف صورتیں آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی ۔ مختلف افعال کے ساتھ یہ "علی" بطور صلہ استعمال ہو کر ان میں متعدد معنی پیدا کرتا ہے ۔ جیسے یہاں (اس آیت میں) "علی" فعل "انعمتَ" کے صلہ کے طور پر آیا ہے اور اس کا تعلق "مادہ" کے لغوی استعمال سے ہے جیسا کہ ابھی اوپر "انعمتَ" کے ضمن میں بیان ہوا ہے ۔

۱ : ۶ : ۱ (۴) [**غَیْرِ**] غَیْرٌ کا مادہ "غ ی ر" اور وزن "فَعْلٌ" ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد غار یغیر غیرًا (باب ضرب سے) صلہ کے بغیر بھی اور مختلف صلات (مثلاً "لِ" اور "علی") کے ساتھ مختلف معنوں (مثلاً خون بہا ادا کرنا، عطا کرنا وغیرہ) کے لئے آتا ہے ــ اور غار یغار غَیْرۃً (باب سمع سے) بمعنی "غیرت کرنا"، بھی آتا ہے ۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے ثلاثی مجرد کا کوئی فعل نہیں آیا ۔ البتہ مزید فیہ کے بعض ابواب (افعال ۔ تفعیل ۔ اور تفعّل) سے بعض افعال اور مشتق اسماء کے کل سات صیغے آئے ہیں ۔ ان کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا ۔

● لفظ "غَیْرٌ" کے اصل معنی تو "دوسرا" یا "کوئی اور" ہیں ۔ اور ان معنوں میں ہی اس کی جمع "اغیار" آتی ہے ۔ (قرآن کریم میں جمع کا صیغہ استعمال نہیں ہوا) ۔

یہ لفظ (غیر) متعدد معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً

۱ ۔ زیادہ تر تو یہ "سِوَیٰ" یعنی "...... کے سوا" ، یا "سوائے ..... کے" کے لئے آتا ہے جیسے غیر اللہ (اللہ کے سوا)

۲ ۔ "......کی بجائے، کی جگہ"، جیسے "ومن یبتغ غیر الاسلام دینا"

۳ ۔ "مگر ......" یعنی الَّا کے معنوں میں جیسے "مالبثوا غیر ساعۃ"

۴۔ "نہ ..... ہوتے ہوئے" جیسے "غیرَ باغٍ ولا عادٍ" میں

۵۔ "جو ..... نہیں ہے" یعنی لَیْسَ کے معنوں میں جیسے "غیرُ مکذوب"

۶۔ کبھی خود اس کے شروع میں باء (بِ) آجاتی ہے۔ اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ "..... کے بغیر" کیا جاتا ہے یعنی اس کی یہ شکل اردو میں مستعمل ہے جیسے "بغیر حساب"[1]

۷۔ اور کبھی یہ کسی صفت میں منفی معنی پیدا کرنے کے لئے آتا ہے۔ اس وقت اس کا اردو ترجمہ "نا ....." سے کیا جاسکتا ہے جیسے "غیر متشابہٍ" اور آیت زیر مطالعہ میں اس لفظ (غیر) کے معنی ۵ یا ۷ والے لئے جا سکتے ہیں۔

ان تمام معنوں کے لئے "غیر" ہمیشہ مضاف ہو کر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ بغیر تنوین کے آتا ہے۔ [اوپر والی عبارتوں میں جہاں جہاں نقطوں والی خالی جگہ (.....) چھوڑی گئی ہے وہ اس کے مضاف الیہ کے (ترجمہ کے) لئے ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر یہ لفظ کسی صفت کے طور پر بھی آتا ہے اور استثناء کے معنی پیدا کرنے کے لئے بھی۔ اور اس کے اپنے اعراب یعنی غیرُ، غیرَ یا غیرِ کے استعمال کے کچھ قواعد ہیں جو اگر مستحضر (یاد) نہ ہوں تو نحو کی کسی کتاب میں "استثناء" کی بحث پر نظر ڈال لیجئے خصوصاً "غیر" اور "سوی" کے استعمال پر۔

۱:۶:۱ (۵) [**الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ**] ۔ اس میں لفظ "مَغْضُوبٌ" (جو یہاں معرف باللام اور مجرور "شکل" میں ہے) کا مادہ "غ ض ب" اور وزن "مَفْعُولٌ" ہے۔ یعنی یہ اسم المفعول کا صیغہ ہے ـــــ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد غَضِبَ یَغْضَبُ غَضَبًا (باب سمع سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں "بہت خشمناک ہونا، سخت غصے

---

[1] قرآن کریم میں یہ "بغیر ....." کی ترکیب قریباً چالیس دفعہ آئی ہے۔ ان تمام مقامات پر "بغیر" کا اردو ترجمہ "بغیر" ہی کیا جاتا ہے۔

میں آنا"۔ یعنی یہ ہمیشہ فعل لازم ہوتا ہے ـــــ اسے متعدی بنانے کے لئے اس کے ساتھ ہمیشہ "علی" کا صلہ استعمال ہوتا ہے مثلاً "غَضِبَ علیہ یا علی فلانٍ" (اس پر یا فلاں پر سخت ناراض ہوا) ۔[غَضِبَہٗ یا غَضِبَ" فلانًا" کہنا بالکل غلط ہے]

● ثلاثی مجرد سے یہ فعل بعض دوسرے صلات ("لِ"، "بِ" اور "فی") کے ساتھ بطور فعل لازم "..... کی خاطر ناراض ہونا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں ان معنی کے ساتھ یہ فعل کہیں استعمال نہیں ہوا ۔ یہ فعل بغیر صلہ کے بطور لازم صرف ایک جگہ (الشوریٰ : ۴۲) اور "علی" کے صلہ کے ساتھ چھ سات جگہ آیا ہے۔

● اس طرح اس فعل سے مجہول بنانا ہو تو اسی صلہ (علی) کے ساتھ بنے گا ۔ یعنی غَضِبَ علی فلانٍ" (اس نے فلاں پر غصہ کیا) کا مجہول ہوگا "غُضِبَ علی فلانٍ (فلاں پر غضب/غصہ کیا گیا) غصہ کرنے والے کو" غاضِبٌ" اور جس پر غصہ کیا گیا اسے "مغضوب علیہ" کہتے ہیں ۔ صرف "مغضوب" کہنا عربی میں درست نہیں ہے ۔ اگرچہ اردو میں ہم اسے اس طرح (بغیر صلہ کے) استعمال کرتے ہیں ۔

● اور یہ صلہ کے بعد مفعول کے مطابق ضمیر لوٹانے (یعنی لانے) والا قاعدہ ہر اس متعدی فعل کے اسم مفعول پر جاری ہوتا ہے جو کسی خاص صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہو۔ یا جسے کسی صلہ کے ذریعے متعدی بنایا جاتا ہو۔ مثلاً "الیہ"، مضاف الیہ، مقسوم علیہ، منعم علیہ، مضروب فیہ وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں [انگریزی میں اس کی مثال APPLIED FOR یا REFERED TO کی قسم کے کلمات ہیں کہ ان میں فعل کی تیسری شکل (جو اسم مفعول کے لئے آتی ہے) کے ساتھ وہی صلہ (PREPOSITION) لگایا جاتا ہے جو فعل کے ساتھ لازماً آتا ہے] ۔

● اس قسم کے مفعول میں تثنیہ یا جمع وغیرہ کی تبدیلی صلہ کے بعد والی ضمیر میں مطلوبہ تبدیلی کے ذریعے ظاہر کی جاتی ہے ۔ یعنی مغضوب علیہ کا تثنیہ "مغضوب علیہما" اور اس کی جمع "مغضوب علیہم" ہوگی ۔ خیال رہے کہ "مغضوبان علیہما" یا "مغضوبین علیہم" نہیں کہیں گے ـــــ یہاں آیت زیر مطالعہ میں "المغضوب

علیھم " آنے کی وجہ یہی قاعدہ ہے۔ اگر فعل " غضب " بغیر صلہ کے متعدی ہوتا تو یہاں " غیر المغضوب بین " آتا۔ اس قاعدہ کو ذہن نشین کر لیجئے۔ آگے چل کر قرآن مجید میں اس کے استعمال کی بکثرت مثالیں سامنے آئیں گی۔

۱:۶:۱ (۶) [وَلَا الضَّآلِّيْنَ] اس میں " وَ " تو عاطفہ (بمعنی " اور ") ہے اور " لا " نفی کے لئے ہے (بمعنی " نہ ہی ")۔ ان حروف (وَ اور لَا) کے استعمال پر ابھی آگے " الاعراب " کے تحت بات ہوگی۔ [الضَّآلِّيْنَ] (جو معرف باللام ہے) کا مادہ " ض ل ل " اور وزن (لام تعریف کے بغیر) " فاعلین " ہے جس کی شکل اصلی " ضالِلین " تھی۔ یعنی یہ اسم الفاعل کی جمع مذکر سالم (کی نصبی اور جری صورت) ہے۔ اور اس میں متحرک حرف (لام) آنے کی وجہ سے پہلے کو ساکن کر کے دوسرے میں مدغم کر دیا گیا ہے (فعل مضاعف کے قاعدے کے مطابق) — اور الف ماقبل مفتوح (اور اسی طرح واو ساکنہ ماقبل مضموم یا یائے ساکنہ ماقبل مکسور) کے بعد اگر " ء " یا کوئی حرف ساکن آجائے تو اس میں مدّ (آواز کو کھینچنا) پیدا ہوتی ہے۔ یہاں " ضآ " میں مدّ کی وجہ یہی قاعدہ ہے۔

● اس مادہ (ض ل ل) سے فعل ثلاثی مجرد ضَلَّ یَضِلُّ ضلالۃً وضلالاً (باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں: " مطلوب راستے سے دور ہونا " (عمداً ہو یا سہواً اور کم ہو یا زیادہ)۔ بنیادی طور پر یہ فعل لازم ہے مگر " جاءَ " اور " اَتٰی " کی طرح یہ متعدی بھی استعمال ہوتا ہے یعنی اس کے ساتھ اس کا مفعول بہ بغیر صلہ کے (بنفسہٖ) بھی آتا ہے مثلاً " ضَلَّ الطریقَ " (وہ راستے سے بھٹک گیا)۔ اور کبھی اس کے ساتھ " عن " یا " فِی " کا صلہ بھی لگتا ہے۔ اس طرح یہ فعل (ثلاثی مجرد) بطور لازم اور متعدی (صلہ کے ساتھ اور اس کے بغیر بھی) متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً (۱) ..... کو کھو بیٹھنا (۲) ..... سے بھٹک جانا (۳) گمراہ ہونا (۴) بہک جانا (۵) ..... سے بچھڑ جانا (۶) بے خبر ہونا (۷) بھول جانا (۸) سرگرداں ہونا (۹) ..... ہٹ جانا

(۱۰) بیکار جانا (۱۱) ہلاک ہونا (۱۲) گم ہو جانا وغیرہ ـــ یہ تمام استعمالات حسبِ موقع ہمارے سامنے آتے جائیں گے ـــ قرآن کریم میں اس سے صرف فعل ثلاثی مجرد کے ساٹھ سے زائد صیغے آئے ہیں۔ اور دیگر (مزید فیہ) ابواب سے اَفعال اور مشتقات وغیرہ تو بہت زیادہ (۱۳۶ کے قریب) آئے ہیں۔

۲:۶: الاعراب

اس حصہ آیت کے اعراب سمجھنے کے لئے اس سے سابقہ آیت کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کیونکہ بعض اعراب اس (پہلی) آیت کے حوالے سے بیان ہوں گے یعنی " اھدِنا الصراطَ المستقیمَ ـ صراطَ الذینَ انعمتَ علیھم ـ غیرِ المغضوبِ علیھم وَلا الضالّین" ـــ پوری عبارت کو سامنے رکھئے۔ اسی لئے اسے دوبارہ لکھ دیا گیا ہے۔

[صِراطَ] پہلے صراط (الصراط المستقیم والا) کا بدل ہے (جسے یہاں بدل الکل کہہ سکتے ہیں) یہ اسی وجہ سے (منصوب کا بدل ہونے کی بنا پر) ہی منصوب ہے اور اس میں علامتِ نصب " طَ " کی فتحہ (ـَـ) ہے ـــ اور آگے مضاف ہونے کی وجہ سے اس کی تنوین ساقط ہو گئی ہے۔

[الذین] اسم موصول ہے اور (صراط کا) مضاف الیہ ہو کر مجرور ہے تاہم مبنی ہونے کے باعث اس میں اعراب ظاہر نہیں ہوتا۔

[انعمت] فعل ماضی صیغہ واحد مذکر مخاطب ہے جس میں ضمیر فاعل " أنتَ " متصل موجود ہے۔ [علیھم] جار (علی) اور مجرور (ھم) مل کر فعل " انعمتَ " سے متعلق ہے۔ ضمیر " ھم " یہاں دراصل تو مفعول بہ اور منصوب ہے مگر علی (صلہ) کے بعد آنے کی وجہ سے یہاں یہ ضمیر (ھم) متصل مجرور بالجر بھی ہے اس لئے فعل (انعمت) کے مفعول بہ ہونے کی بنا پر اس کو یہاں محلاً منصوب بھی کہہ سکتے ہیں ـــ " انعمتَ علیھم " ـــ " الذین " کا صلہ ہے اور صلہ موصول مل کر

"صراط" کا مضاف الیہ ہے اور یہ سارا مرکب اضافی [صراط الذین انعمت علیھم یعنی [الذین انعمت علیھم (جن پر تو نے انعام کیا) کا صراط (راستہ)] "الصراط المستقیم" کا بدل الکل ہے۔ یعنی "الصراط المستقیم" (سیدھا راستہ، وہی (چیز) ہے جو "صراط الذین انعمت علیھم" (تیرے انعام یافتہ بندوں کا راستہ) ہے۔

[غیرِ] یہ الذین ..... کی صفت یا اس کا بدل الکل ہو کر مجرور ہے۔ (علامتِ جر "ر" کی کسرہ (ـِ) ہے) - اور یہ آگے مضاف ہے [المغضوبِ] "غیر" کا مضاف الیہ ہو کر مجرور ہے۔ (علامتِ جر "بِ" کی کسرہ (ـِ) ہے)۔ اور [علیھم] جار مجرور مل کر "مغضوب" سے متعلق ہے۔ نحو کی اصطلاحی زبان میں "علیھم" یہاں نائب فاعل ہو کر محلاً مرفوع ہے۔ کیونکہ "المغضوبِ علیھم" دراصل "الذین غُضِبَ علیھم" ہے۔ یعنی ضمیر "ھم" فعل مجہول کے نائب فاعل کا کام دے رہی ہے۔

[ولاالضالین] میں واو ("و") تو عاطفہ (بمعنی اور) ہے اور "لا" محض تاکیدِ نفی کے لئے آیا ہے۔ یعنی "غیر" میں جو نفی ("نا") کے معنی ہیں محض اس کی تاکید مزید کے لئے ہے۔ جسے نحو کی زبان میں "زائدہ" کہتے ہیں[1] "الضالین" یہاں "المغضوب علیھم" پر معطوف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے اور اس کی علامتِ جر "یاء" ہے یعنی "ـِیْنَ" والی "یاء" جو جمع مذکر سالم کی مجرور صورت ہے۔

● ہم نے ابھی لکھا ہے کہ "غیرِ" یہاں "الذین ....." کی صفت یا

---

[1] نحوی "زائد" کی اصطلاح ایسے حرف یا لفظ کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کے ہونے یا نہ ہونے سے کسی اعرابی تبدیلی پر کچھ اثر نہ پڑتا ہو جیسے یہاں "الضالین" اس "لا" کے بغیر بھی مجرور ہوتا۔ "زائد" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے ہونے یا نہ ہونے سے معنوں میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مثلاً یہاں "لا" سے مزید تاکید کے معنی پیدا ہوتے ہیں یعنی "نہ ہی" ـــ مطلقاً نفی کے معنی تو "غیر" کی وجہ سے بھی پیدا ہو رہے تھے۔

بدل (الکل) ہوسکتا ہے۔ اور یہ مضاف بھی ہے ـــــ اس کی وضاحت یہ ہے کہ "غیر" اپنے مضاف الیہ سمیت یعنی پوری عبارت "غیر المغضوب علیھم و لا الضالین" ـــــ اپنے سے پہلے والے صلہ موصول یعنی "الذین انعمت علیھم" ـــــ کی صفت یا نعت بھی بن سکتی ہے اور اس کا بدل بھی ہوسکتی ہے۔ اور بدل مانیں تو پھر بدل الکل ہی ہوسکتا ہے۔ پہلی صورت میں (صفت یا نعت ہونے کی صورت میں) عبارت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسے "الذین انعمت علیھم" (تیرے انعام یافتہ بندے) جو "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" ہوں (یعنی نہ مغضوب ہوں نہ گمراہ ہوں) اور دوسری صورت یعنی بدل ماننے سے مطلب یہ ہوگا کہ "الذین انعمت علیھم" (تیرے صحیح انعام یافتہ بندے) وہی تو ہیں جو "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" (نہ مغضوب ہیں اور نہ ہی گمراہ ہیں)۔

● صفت والے معنی لینے سے یہ بحث پیدا ہوسکتی ہے کہ کیا کچھ لوگ بیک وقت انعام یافتہ" (من وجہٍ) اور "مغضوب وگمراہ (" من وجہٍ") بھی ہوسکتے ہیں یعنی جن میں منعم علیھم (انعام یافتہ) ہونا اور المغضوب علیھم والضالین (مغضوب اور گمراہ ہونا) دونوں صفات جمع ہوں۔ بدل والے معنی لئے جائیں تو یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے بدل مراد لینا زیادہ بہتر ہے[1]۔

● اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہمارے ہاں اکثر تراجم میں اس حصۂ آیت "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" کا ترجمہ " نہ مغضوب علیھم کا (راستہ) اور نہ گمراہوں کا (راستہ)"۔ یا اسی مفہوم کے لئے ملتے جلتے الفاظ سے کیا جاتا ہے جس میں اس عبارت کا تعلق لفظ "صراط" سے بنتا ہے۔ یہ ترجمہ صرف اس صورت میں درست قرار دیا جاسکتا ہے جب "غَیْرِ" (منصوب) پڑھا جائے۔ اس صورت میں تقدیر

---

[1] مزید بحث کے لئے چاہیں تو دیکھئے مثلاً روح المعانی ج ۱ ص ۹۵-۹۴، مجالس سبعہ ص ۱۳۸-۱۳۷ یا الکشاف ج ۱ ص ۶۹۔

(خود بخود ذہن میں آنے والی عبارت) یوں ہوگی "غیرَ صراط المغضوب علیھم..... ....." یعنی "غیرَ" لفظ "صراط" (جو خود بھی "اھدنا" کے مفعول "الصراط" کا بدل ہو کر منصوب ہے) کی صفت یا بدل سمجھا جائے گا۔ "الذین ....." کی نہیں[1]

● اردو تراجم میں سے صرف شاہ عبدالقادرؒ اور شیخ الہندؒ نے "غیر المغضوب ..... کو "الذین ....." ہی کی صفت یا بدل سمجھ کر ترجمہ کیا ہے۔ انگریزی تراجم میں سے صرف علامہ عبداللہ یوسف علی نے اس طرح ترجمہ کیا ہے۔ اور نیچے (فٹ نوٹ) میں "غیر" کے "صراط" کی بجائے "الذین ....." سے متعلق ہونے کی صراحت کی ہے۔ (انگریزی ہی تراجم میں سے) محمد اسد مشہور نومسلم یورپی عالم نے صرف نیچے (فٹ نوٹ میں) اس ترجمہ کا بحوالہ زمخشری ذکر کیا ہے[2]

—— فارسی تراجم میں سے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "بجز" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے (راہ کا ذکر کئے بغیر) —— باقی اردو، فارسی اور انگریزی مترجمین قرآن نے اسے "صراط" ہی سے متعلق کرتے ہوئے ترجمہ کر لیا ہے جسے "مفہومی" یا "تفسیری" ترجمہ تو کہا جا سکتا ہے۔ مگر روایتِ حفص کی ترکیب نحوی اور لفظی ترجمہ سے قریب تر نہ ہونے کے اعتبار سے درست نہیں ہے —— اسی طرح جن مترجمین نے "غضب" کے ساتھ "تیرا" یا "تو نے" کا اضافہ کیا ہے وہ بھی "انعمت" کی ضمیر فاعل کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے۔ کیوں کہ یہاں "غضب" سے مراد تو "اللہ کا غضب" ہی ہے۔ تاہم یہ اضافہ بھی ترجمہ کو لفظی سے زیادہ "تفسیری" بناتا ہے۔

---

[1] دیکھئے "غیر" کی قراءت نصب پر بحث۔ روح المعانی ج ۱ ص ۹۵۔ خیال رہے ہم صرف روایتِ حفص کے مطابق اعراب بیان کر رہے ہیں جو یہاں قراءت الجر (غیر) ہے نصب کی قراءت بھی ثابت ہے مگر وہ ہمارے دائرۂ عمل (SCOPE) سے خارج ہے دیکھئے مقدمہ

[2] دیکھئے الکشاف للزمخشری ج ۱ ص ۶۹۔

۱: ۶: ۳ الرسم:

[صراط (صرط) الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم و لا الضالین]

لفظ [صراط] یا [صرط] پر ابھی پچھلی آیت میں بات ہو چکی ہے (۱: ۵: ۳)۔[الذین] ہمزۂ وصل اور ایک "لام" (مشدّد) کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور "ذ" اور "ن" کے درمیان "ی" (بصورت نبرہ یعنی دندانہ) لکھی جاتی ہے۔ [النعمت] ہمزۂ قطع اور لمبی "ت" کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ [علیهم] میں "علی" کی "ی" کو "هم" کی "ه" کے ساتھ ملا کر لکھا جاتا ہے۔[غیر المغضوب علیهم] میں "غیر" کے بعد "المغضوب" کا لام تعریف باثبات همزۃ الوصل لکھا جاتا ہے اور "علیهم" سابق کی طرح موصول (ملا کر) لکھا جاتا ہے۔[ولا الضالین] میں "ولا" کے بعد "الضالین" ابتدائی همزۃ الوصل اور درمیانی الف (ضؔ اور لؔ کے درمیان) کے اثبات کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔صرف صاحب نثر المرجان (ج ۱ ص ۹۹) نے اس الف کے حذف کی طرف (بحوالہ مصحف الجزری) اشارہ کیا ہے (یعنی الضلین)۔تاہم کتب رسم میں "ضالین" کے الف کے حذف کا کہیں ذکر نہیں ہے۔اور لؔ کی تشدید کی بناء پر ماقبل کی "مدّ" کے لئے بھی اس الف کا اثبات ضروری ہے۔

● ملاحظہ کیجیے کہ اس (زیرِ مطالعہ) آیت کے تمام کلمات کا رسم الخط عام املائی رسم کے مطابق ہی ہے۔اوپر جو "قواعدِ املاء" بیان ہوئے ہیں وہ سب عام عربی املاء کے قواعد ہی ہیں۔البتہ صرف کلمہ "صراط" کا رسم مختلف فیہ ہے۔اس پر مفصّل بات سابقہ آیت کے "الصراط" میں آچکی ہے۔(۱: ۵: ۳)۔ اور "الضالین" کے الف کے حذف کا قول شاذ اور لہٰذا ناقابلِ قبول ہے۔ عام قواعدِ املاء کی تفصیل ہم نے اس لئے دی ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ قرآن کا رسم الخط

بیشتر (اسّی فیصد سے بھی زیادہ) عام رسم معتاد کے مطابق ہی ہے صرف چند مخصوص کلمات میں اختلاف ہے۔ آئندہ ہم صرف ان قرآنی کلمات کے رسم کی نشان دہی کردیا کریں گے جن کا رسم (عثمانی) عام املائی رسم سے مختلف ہوگا۔ ہر ایک کلمہ کی املاء بیان کرنا ضروری نہیں ہے کیوں کہ عنوان " الرسم " سے ہماری مراد دراصل تو " الرسم العثمانی " یا الرسم المصحفی " ہی ہے۔

۱:۶:۴ الضبط

(صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین)

اس آیت میں اختلافِ ضبط کی حسب ذیل صورتیں موجود ہیں:۔

● همزة الوصل کی علامت (صلہ) ڈالنا یا نہ ڈالنا اور ڈالنے کی صورت میں اس کی شکل کا اختلاف ٓ ، ا یا ا یعنی سبز گول نقطہ۔ اس اختلاف کا اثر کلمات " الذین " ، " المغضوب " اور " الضالین " کے ضبط میں ظاہر ہوگا (یہ بات بیان ہوچکی ہے کہ همزة الوصل کی یہ شناختی علامت صرف عرب اور افریقی ملکوں میں ڈالی جاتی ہے (دیکھئے بسم اللہ کی بحث)۔

● همزۂ قطع کی علامت قطع ڈالنا یا نہ ڈالنا اور ڈالنے کی صورت میں اس کی شکل کا اختلاف (ء ، ٤ ، ٕ یا ٥ : زرد گول نقطہ) یہ علامت بھی صرف عرب اور افریقی ملکوں میں ڈالی جاتی ہے۔ اس اختلاف کا اثر صرف کلمہ " انعمت " کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

● واو ماقبل مضموم پر علامتِ سکون ڈالنے یا نہ ڈالنے کا اختلاف یہ علامت صرف برصغیر میں ڈالی جاتی ہے۔ اس اختلاف کا اثر کلمہ " المغضوب " کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

● یائے ماقبل مکسور پر علامتِ سکون ڈالنا یا نہ ڈالنا۔ یہ علامت بھی صرف برصغیر میں ڈالی جاتی ہے۔ اس اختلاف کا اثر دو کلمات " الذین " اور " الضالین " کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

● یاء کے ماقبل مکسور حرف کی حرکت (کسرہ) کی شکل کا اختلاف (ـِ ، ـٖ) مؤخر الذکر شکل یعنی کھڑی زیر کی صورت میں لکھنے کا رواج صرف ترکی اور ایران کے مصاحف میں رہتے !! اس اختلاف کا اثر بھی دو کلمات " الذین " اور " الضالین " کے ضبط میں ظاہر ہو گا۔

● الف (ساکنہ) کے ماقبل مفتوح کی حرکت (فتحہ) کی شکل کا اختلاف (ـَ ، ـٰ) صرف ایران میں اسے کھڑی زبر کی صورت میں لکھنے کا رواج ہے۔اس اختلاف کا اثر کلمہ " لا " اور " صراط " (باثباتِ الف لکھنے کی صورت میں) کے ضبط میں ظاہر ہو گا

● محذوف الالف لفظ میں اس (محذوف) الف کے لئے علامتِ ضبط کا اختلاف (ـٰ ، ـَٰ)۔ اس پر بات " بسم اللہ " کے ضمن میں " الرحمٰن " کے ضبط کے سلسلے میں ہو چکی ہے)۔فتحہ مع الف صغیرہ (کھڑی زبر) ڈالنے کا رواج صرف عرب اور افریقی ملکوں میں ہے۔ اس اختلاف کا اثر یہاں لفظ " صراط " بحذف الف (صرط) لکھنے والے ملکوں کے ضبط میں ظاہر ہو گا۔

● کلمہ " لا " میں افریقی ملکوں میں پہلا سرا الف اور دوسرا سرا " لام " سمجھا جاتا ہے۔مصر اور مشرقی ملکوں میں اس کے برعکس سمجھا جاتا ہے۔ اس اختلافِ ضبط کا اثر کلمہ " ولا " کے ضبط میں ظاہر ہو گا۔

اس طرح اس آیت میں اختلاف ضبط کی مندرجہ ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں:

صِرَاطَ ، صِرٰاطَ ، صِرَٰطَ ، صِرٰطَ

الَّذِيْنَ ، الَّذِينَ ، الَّذِينَ ، ٱلَّذِينَ

أَنْعَمْتَ ، أَنْعَمْتَ ، أَنْعَمْتَ ، (٥ = زرد گول نقطہ)

عَلَيْهِمْ عَلَيْهِمُ اور غَيْرِ، غَيْرِ	کا ضبط علامت سکون کے فرق کے سوا ہر جگہ ایک ہے۔

الْمَغْضُوْبِ ، الْمَغْضُوبِ ، الْمَغْضُوبِ ، الْمَغْضُوبِ

وَلَا الضَّآلِّيْنَ ، وَلَا الضَّآلِّيْنَ ، وَلَا الضَّآلِّيْنَ

وَلَا الضَّآلِّيْنَ

نوٹ : ہمارے ہاں ۔ بلکہ تمام مشرقی ممالک میں آیات قرآنی کی کوفی گنتی رائج ہے۔ تاہم صرف برصغیر میں غیر کوفی آیت کے آخر پر " ۵ " کی علامت ڈالی جاتی ہے اور اس پر کوئی نمبر نہیں ڈالا جاتا۔ آیت زیر مطالعہ میں پہلے " علیہم " پر ایک غیر کوفی آیت ختم ہوتی ہے یعنی مدنی اوّل، مدنی آخر، بصری اور شامی طریق شمار کے مطابق یہاں آیت ختم ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے بھی یہاں یہ نشان " ۵ " ڈالا ہے۔

● سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کے آخر پر " آمین " کہنا سنّت سے ثابت ہے تاہم یہ لفظ قرآن کا حصّہ نہیں ہے۔ اس لئے اسے لکھا نہیں جاتا۔ اور لکھنا درست بھی نہیں۔ اس لئے کہ مصاحف عثمانیہ میں یہ نہیں لکھا گیا تھا۔ " آمین " کے معنی، اس کے تلفظ کی دوسری صورتوں اور اس کے متعلق فقہی احکام کے لئے کسی مستند تفسیر کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

بقیہ: حرفِ اوّل

(۱) ایف اے اور بی اے کی نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا ایک معیّن نصاب بھی قرآن کالج کے نصاب میں شامل ہوگا۔ یہ معیّن نصاب عربی زبان کی پختہ بنیادوں پر تدریس، ترجمۂ قرآن، اصول حدیث، فقہ اور تجوید کی مبادیات ہی پر مشتمل نہیں ہوگا، قرآن حکیم کے ایک منتخب نصاب کی تشریح وتفسیر اور لیکچرز کے ذریعے دین کا ایک جامع اور حرکی تصور بھی موثر طور پر طلبہ کے سامنے لایا جائے گا جو طلبہ کی آئندہ عملی زندگی میں ان کے لیے ان شاء اللہ العزیز اہم سرمایہ ثابت ہوگا۔

(۲) قرآن کالج کی سابقہ تین سالہ تعلیمی اسکیم برائے بی اے کے مقابلے میں کہ جس میں دینی تعلیم کے لیے طلبہ کا ایک اضافی سال صرف ہوتا تھا، نئی اسکیم میں کوئی اضافی وقت خرچ نہیں ہوگا۔ میٹرک کے بعد چار سال کے عرصے میں گریجویشن کی تکمیل ہو جائے گی اور اسی دوران مذکورہ بالا دینی نصاب کی تدریس بھی مکمل کرا دی جائے گی۔ (ان شاء اللہ)

(۳) دیگر کالجوں کے مقابلے میں کہ جہاں یونین ازم، طلبہ سیاست، ہڑتالوں، ہنگاموں اور بے حساب چھٹیوں کے سبب سبھی کچھ ہوتا ہے سوائے تعلیم کے، قرآن کالج میں پڑھائی کے لیے ماحول نہایت سازگار رہوگا۔ تعلیم وتدریس بھی باقاعدگی سے ہوگی اور ڈسپلن کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا اور یہی وہ دو چیزیں ہیں جن سے ہمارے تعلیمی ادارے مکمل طور پر تہی دست ہو چکے ہیں۔

(۴) اور آخری بات جو ہمارے نزدیک "آخری تحتوُنہا" کے درجے میں ہے کہ قرآن کالج کے طلبہ کے لیے دنیاوی کیرئرز کے راستے بھی مسدود نہیں ہونگے۔ ایم اے / پی ایچ ڈی کر کے لیکچرر شپ حاصل کرنا، سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے سول سروس میں آنا، ایل ایل بی کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کرنا طلبہ کی صوابدید پر ہوگا۔

ہمیں یقین ہے کہ قرآن کالج کے طلبہ دینی اور دنیاوی دونوں علوم کے اعتبار سے دیگر کالجوں کے طلبہ سے ممتاز ہونگے اور دینی پس منظر رکھنے کے باعث مستقبل کی عملی زندگی میں دنیاوی مشاغل میں مصروف رہتے ہوئے بھی خدمتِ دین کے کاموں میں بھرپور حصہ ادا کرنے کی صلاحیت واستعداد سے آراستہ ہوں گے۔

تاہم ہمارے اعتبار سے قرآن کالج کا 'حاصل' وہ طلبہ ہونگے جو تعلیم وتعلّم قرآن ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں قرآن حکیم کی ہدایت و رہنمائی کو وقت کی اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں جو وقت کی اصل ضرورت ہے اور جس کے لیے درحقیقت قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج کی بنیادیں اٹھائی گئی ہیں۔

ہم نے اس کام کیلئے اللہ کی نصرت وتائید سے ایک پلیٹ فارم فراہم کر دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اس کام کی اہمیت کو محسوس کرے اور اس اہم مشن کو آگے بڑھانے میں اپنا حصہ ادا کرنے میں کسی کوتاہی یا بخل کو راہ کی رکاوٹ نہ بننے دے۔ ★

مؤلف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مترجم: ڈاکٹر ابصار احمد

(۱۳)

منشورِ اسلام

مستقبل کی اسلامی ریاست امن پسند اور امن کا گہوارہ ہوگی

مستقبل میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست اپنی ہم عصر ریاستوں سے نصب العین کے اختلاف کے باوجود انتہائی پُر امن اور خوشگوار تعلقات رکھے گی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک صاحبِ ایمان کے لیے صحیح نصب العین کی محبّت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے معتقدین کے ساتھ نظریاتی اختلاف کے باوجود بے لوث اور پُر خلوص محبّت کے روابط رکھے۔ ان حقائق کا اسے پُورا شعور و ادراک ہوتا ہے کہ :

(۱) تمام انسان بنیادی طور پر اپنی فطرت کے اعتبار سے اچھے ہیں اور صحیح نصب العین ہی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے اعتقاد اور عمل میں جو کجی آتی ہے وہ سماجی حالات اور غلط نظامِ تعلیم کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہی چیز انہیں غیر معقول رویّے، ضد، ہٹ دھرمی اور ظلم و تعدّی پر ابھارتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ وہ کم فہمی اور حقائق سے بے خبری کی بنا پر کرتے ہیں۔

(۲) تمام انسان ایک خدا (وحدہٗ لاشریك لہٗ) کی مخلوق ہیں اور وہ ان سب کا ربّ ہے اور ان سے محبّت کرتا ہے۔ وہ ان سب کے بارے میں چاہتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم پر چل کر اس کے انعام کے مستحق بنیں۔ چنانچہ اس نے تمام انسانوں کو زندگی بسر کرنے کے وسائل و اسباب اور صحیح نصب العین تک پہنچنے کے مواقع کم و بیش یکساں عطا کیے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس نے تمام اُمّتوں کو نبیوں کے ذریعے اپنے اوامر و نواہی سے باخبر کیا ہے۔

(۳) ایک مسلمان پر یہ فریضہ دینی طور پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی جملہ مخلوق سے

نہ صرف محبّت کرے، بلکہ ان کی فکری و روحانی بالیدگی اور ارتقاء کے لیے سعی و جہد بھی کرے۔ پوری بنی نوع انسان کے درمیان بھائی چارے اور اخوت کی طرف اشارہ رسولِ مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قولِ مبارک میں ملتا ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَشْھَدُ اَنَّکَ اَنْتَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ وَ اَنَّ الْعِبَادَ کُلَّھُمْ اِخْوَۃٌ۔

"اے پروردگار! میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ہی اللہ ہے، تیرے سوا کوئی معبودِ حقیقی نہیں اور یہ کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔"

(۴) انسانوں کے ساتھ خیر خواہی اور انہیں ایمان و اسلام کی طرف بلانے کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ان کے ساتھ محبّت کی جائے اور حسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائے۔ ان کے لیے روحانی بالیدگی کی خواہش و عزم کسی طور بھی ان کے ساتھ نفرت سے میل نہیں کھاتے۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشادِ باری تعالےٰ ہے:

وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط (بنی اسرائیل: ۵۳)

"اور میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ ایسی بات کریں جو اچھی ہو۔"

اسی طرح کلام پاک میں ایک اور جگہ بُرائی کے بدلے اچھائی کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۴)

"جواب میں وہ کہو جو اُس سے بہتر ہو۔ پھر (تم دیکھ لوگے کہ) تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا گویا کہ گرمجوش دوست ہے۔"

خوش خلقی اور حسنِ سلوک کو دعوتِ دین کے ضمن میں بھی پیشِ نظر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۃ النحل کی آیت ۱۲۵ میں ارشاد باری تعالیٰ

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط (النحل: ۱۲۵)

"بلاؤ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے سے اور اُن

کے ساتھ ایسے طریقے پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو۔"

(۵) مسلمانوں یعنی اہلِ ایمان کو یہ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ کسی پر کوئی عقیدہ ٹھونسا جا سکتا ہے اور نہ کسی کے دل میں کسی نصب العین سے بالجبر محبت کے جذبات پروان چڑھائے جا سکتے ہیں۔ نصب العینی محبت آزاد مرضی اور آزادی کے ماحول میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم زبردستی کسی کے دل میں کوئی عقیدہ یا محبت پیدا نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالےٰ نے اس حقیقت کا اظہار واشگاف الفاظ میں اِن الفاظِ قرآنیہ میں کر دیا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ

(البقرۃ: ۲۵۶)

"دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے، بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے۔"

(۶) افکار کی قوت اسلحے کی قوت سے زیادہ ہوتی ہے اور یہ کہ بالآخر وہی نظریۂ حیات ہر جگہ غالب آکر رہے گا جو عقلی اور سائنسی بنیادوں پر استوار ہو۔ چنانچہ ایک صاحبِ ایمان کو اپنے دین کی اشاعت اور غلبے کے لیے دوسرے نظریاتِ حیات سے خواہ مخواہ مخاصمت مول نہ لینی چاہیے۔ ایک اسلامی ریاست اپنی حدود کے اندر غیر مسلموں کو مکمل تحفظ اور مذہبی آزادی فراہم کرتی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات مسلمانوں کو اپنی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک، رواداری اور امن و آشتی کا حکم دیتی ہیں۔ انہیں اپنے مذہب کے مطابق عمل کی آزادی دینا مسلمان مملکت کا فرض ہے۔

وہ حالات جن میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے

لیکن اپنی جگہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کوئی باطل نظریہ بہت منہ زور اور جارحانہ ہو جائے اور لوگوں کو طاقت کے بل پر کفر پر ابھارے، تو پھر مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں اور اس کی سرکوبی کریں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اگرچہ کوئی صاحبِ ایمان کسی دوسرے غیر مسلم شخص سے نفرت نہیں کرتا، لیکن اگر وہ اپنے باطل نظریات کو بالجبر پھیلاتا ہے اور دوسرے لوگوں کو حق سے برگشتہ کرتا ہے یا حق کی طرف آنے سے روکتا ہے تو پھر مسلمان کا خاموش تماشائی

بنے رہنا صرف منافقت کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ وہ صاحبِ ایمان ہوتے ہوئے اپنی پوری طاقت سے اس باطل کو دبانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ لوگ حق کی دعوت سُن کر آسانی سے اس کی طرف آسکیں اور اپنی روحانی تسکین و بالیدگی (ارتقاء) حاصل کر سکیں اور اس سلسلے کے تمام موانع دُور ہو سکیں۔ انہی حالات میں وہ جہاد کا علم بلند کرتا ہے اور اللہ تعالےٰ کی جانب سے سرکشوں کی سرکوبی کر کے بنی نوع انسان کی حق کی طرف پیش قدمی کو آسان بناتا ہے۔ اسلام صرف کشور کشائی یا مالِ غنیمت کے لیے جنگ کے خلاف ہے، لیکن جب باطل حق کا راستہ روکے تو پھر یقیناً مسلمانوں کو باطل قوتوں سے ٹکرانے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں آنحضور صلعم اور آپ کے صحابہ کرام کی سیرت و کردار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ (الفتح: ۲۹)

"محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسُول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (مگر) آپس میں رحم دل ہیں"۔

مسلمانوں کی یہی کیفیت سورۃ المائدۃ میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ (المائدۃ: ۵۵)

"نرم دل ہیں اہلِ ایمان پر (جبکہ) زبردست ہیں کافروں پر، جہاد کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اور نہیں ڈرتے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے"۔

ان آیاتِ مبارکہ میں مسلمانوں کی ان کفّار پر سختی کا ذکر ہے جو فقہی اصطلاح کے مطابق حربی کافر ہوں، یعنی وہ اپنے غلط نصب العینوں کے ضمن میں بہت متشدّد ہوں اور دوسروں کو بھی جبر کے ساتھ اپنے راستے پر چلنے پر زور دیں گویا اس طرح یہ کفّار از خود حق کو مسلّح تصادم کی دعوت دیتے ہیں۔ ایک صاحبِ ایمان پر لازم ہے کہ وہ اس قسم کے کسی کافر کے ساتھ دلی محبّت و الفت کا رشتہ نہ رکھے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی اپنے دین کے ساتھ وابستگی ڈھیلی اور مشکوک ہے۔ کفّار اور غلط نظریات رکھنے والوں کے ساتھ قلبی تعلّق اور بھائی چارہ باطل کے

ساتھ سازباز کے مترادف ہوگا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس کا مطلب حق کے مقابلے میں باطل نظریات اور قوتوں کے ساتھ تعاون ہوگا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ج

(آل عمران: ۲۸)

"اہلِ ایمان مومنین کو چھوڑ کر (ان کے بجائے) کفار کو اپنا ولی وغم خوار نہ بنائیں۔"

مزید برآں سورۃ المائدۃ کی دوسری آیت میں حکم دیا گیا ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ص وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ص (المائدہ: ۲)

"اور نیکی اور پرہیزگاری (کے کاموں) میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی (کے کاموں) میں تعاون نہ کرو۔"

مسلم ریاست میں بھی جملہ غیر مسلموں کے جان و مال کی حفاظت اور مذہبی آزادی کی ذمہ داری اسی وقت تک نبھائی جاتی ہے جب تک وہ ریاست کے مفادات کے خلاف برسرِ پیکار نہ ہوں یا اپنے نظریات کی دعوت و تبلیغ صرف اپنے اہلِ مذہب میں کریں۔ تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ باطل نظریاتِ حیات کی اکثریت حق کو برداشت نہ کرتے ہوئے اس کے خلاف سرگرمِ عمل ہو جاتی ہے اور یہی چیز تاریخ میں ادیان اور نظریات کے درمیان مسلسل آویزش کا سبب بنی ہے۔ اگر کہیں جنگ ختم ہوئی بھی ہے تو اس پُرامن وقفے کو زیادہ بڑے پیمانے کے تصادم کے لیے تیاری میں صرف کیا گیا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حق یعنی راست نظریۂ حیات کو مجبوراً غلط نظریات کی ریشہ دوانیوں کے خلاف ہتھیار اٹھانا پڑتے ہیں۔ لیکن اس تصادم اور کشمکش میں ہمیشہ دینِ حق کو ہی فتح نصیب ہوتی ہے کیونکہ یہی وہ نظریۂ حیات ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور انسان کے مادی و روحانی ارتقاء کی ضمانت دیتا ہے۔ حق و باطل کے درمیان کشمکش اور تصادم کا اشارہ مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنیہ میں ملتا ہے:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ط (الانبیاء: ۱۸)

"بلکہ ہم تو حق کو باطل پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا سر کچل ڈالتا ہے۔ پھر وہ اسی دم نابود ہو جاتا ہے۔"

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل: ۸۱)

"اور (اے پیغمبر) اعلان کر دو کہ حق آ گیا اور باطل نیست و نابود ہوا۔ بیشک باطل تو نیست و نابود ہی ہونے والا ہے۔"

باطل نظریات کی بنیادیں چونکہ کمزور ہوتی ہیں، اس لیے وہ کبھی بھی انسانوں پر اپنا تسلّط قائم نہیں رکھ سکتے۔ جہاں کہیں بھی باطل کا غلبہ ہوتا ہے، تھوڑے ہی عرصے میں لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور علمِ بغاوت بلند کر کے اس کے زوال و انحطاط کا باعث بنتے ہیں۔

اسلام اور انسانی ارتقاء

سطورِ بالا میں چونکہ میں نے لفظ 'ارتقاء' کا استعمال متعدّد بار کیا ہے، اس لیے اس کے ضمن میں قدرے وضاحت ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ارتقاء کا تصوّر اسلام میں نیا نہیں ہے۔ قرآن کی پہلی آیت کے مطابق اللہ تمام عالمین کا ربّ یعنی مربّی و پالنہار ہے۔ اسی طرح وہ آسمانوں اور زمین کا ربّ بھی ہے۔ ۔ ۔ ۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ تاہم ترقی پذیری اور ارتقاء کے اصول از روئے قرآن وہ نہیں ہیں جو ڈارون یا دوسرے مادیّت پسند مفکّرین نے تنازع للبقاء یا فطری انتخاب کی صورت میں بیان کیے ہیں۔ ارتقاء کے پیچھے اصل کارفرما اصول یا قوّت مشیّتِ ایزدی کی ہے۔ خدا کی بنیادی صفات میں سے صفتِ ربوبیت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی مرضی کے مطابق مختلف مخلوقات کو ارتقائی منازل سے گزار کر اپنی اعلیٰ ترین حالت تک لے جاتا ہے۔ ڈارون اور ہکسلے کے مقابلے میں فرانسیسی مفکّر برگساں کا فلسفۂ تخلیقی ارتقاء قرآن کے نظریۂ ارتقاء کے زیادہ قریب ہے۔ برگساں نے چونکہ اپنا فکر انتہائی معقول مسلّمات پر استوار کیا ہے اس لیے وہ میکانکی ارتقاء کے مقابلے میں زیادہ قابلِ فہم اور قرینِ قیاس ہے۔ چنانچہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ قدیم اور جدید دونوں ادوار کے بعض اہم مسلمان مفکّرینِ قرآن ارتقائی نقطۂ نظر کے حامل ہیں مثلاً جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) ابن مسکویہ

(متوفی ۴۲۱ھ کتاب الفوز الاصغر)، رومی، اقبال، طنطاوی وغیرہ۔ قرآن میں وارد شدہ قصہ آدم پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

"لہٰذا قرآن مجید نے ہبوطِ آدم کا ذکر کیا تو یہ بیان کرنے کے لیے نہیں کہ کرۂ ارض میں انسان کا ظہور کس طرح ہوا۔ اس کے پیشِ نظر حیاتِ انسانی کا وہ ابتدائی دور ہے جب اس پر جبلّی خواہشات کا غلبہ تھا اور جس سے گزر کر اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ وہ اپنی ذات میں آزاد اور اس لیے شاکر اور نافرمانی دونوں کا اہل ہے۔" (صفحہ ۸۵)

اسی طرح کرۂ ارضی میں انسان کے ظہور پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال سورۃ الواقعہ کی مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنیہ نقل کرتے ہیں:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ○
عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ○
وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ○

(الواقعۃ: ۶۰-۶۲)

"ہم ہی نے تم میں موت کو مقدر کر رکھا ہے اور ہم عاجز نہیں ہیں اس سے کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور ایک اور ہستی میں جس کو تم نہیں جانتے تم کو بنا کھڑا کریں۔ اور تم جان چکے ہو (اپنی) پہلی پیدائش کو، پھر سبق کیوں نہیں لیتے؟"

آگے چل کر علامہ لکھتے ہیں:

"لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی نشأۃ الاولیٰ کیوں کر ہوئی۔ ہم نے ابھی چند آیات کا حوالہ دیا تھا۔ ان کے آخری حصّے میں جن حقائق پر توجہ دلائی گئی ہے یہ انہی کا نتیجہ تھا کہ فلاسفۂ اسلام کی آنکھوں میں حقیقت کی ایک نئی جھلک عیاں ہوگئی۔ جاحظ (متوفی: ۲۵۵) پہلا شخص ہے جس نے ان تغیّرات کی طرف اشارہ کیا جو نقلِ مکانی، علی ہذا ماحول کے زیرِ اثر حیوانات کی زندگی میں بالعموم رونما ہو جاتے ہیں۔ آگے چل کر جاحظ کے ان نظریات کو اس حلقے نے جو 'اخوان الصّفا' کے نام سے مشہور ہوا مزید وسعت دی۔ ابن مسکویہ (متوفی: ۴۲۱ھ) پہلا مسلمان مفکّر ہے جس نے انسان کے مبداء و مصدر کے بارے میں ایک واضح اور متعدد پہلوؤں سے ایک

جدید نظریہ پیش کیا۔ بعینہٖ یہ بھی ایک قدرتی امر تھا، علیٰ ہذا قرآن کی روح کے عین مطابق کہ رومی بقائے دوام کے مسئلے کو ارتقائے حیات ہی کا ایک مسئلہ ٹھہراتا، کیونکہ ہم اس کا فیصلہ صرف مابعد الطبیعی دلائل کی بنا پر نہیں کر سکتے جیسا کہ بعض فلاسفۂ اسلام کا خیال تھا۔ لیکن پھر عصرِ حاضر میں تو اس نظریے سے زندگی کے بارے میں امید و وثوق اور ذوق و شوق کی بجائے مایوسی اور افسردگی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور نے بغیر کسی دلیل کے یہ فرض کر لیا ہے کہ ہم انسان اپنے ارتقاء کی جس منزل میں ہیں اسے نفسیاتی یا عضویاتی جس لحاظ سے بھی دیکھا جائے ہمارے ارتقاء کی آخری منزل ہے۔ لہٰذا بحیثیت ایک حادثۂ حیات کے موت میں کوئی تعمیری پہلو مضمر نہیں۔ دراصل عصرِ حاضر کو آج ایک رومی کی ضرورت ہے جو دلوں کو زندگی، امید اور ذوق و شوق کے جذبات سے معمور کر دے۔ مولانا رومیؒ کے یہ اشعار کس قدر بے نظیر ہیں۔

آمدہ اوّل بہ اقلیمِ جماد — وز جمادی در نباتی او فتاد
سال ہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بحیوانی فتاد — نایدش حالِ نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوے آں — خاصہ در وقتِ بہارِ ضیمراں
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت
عقلہائے اولینش یاد نیست — ہم ازیں عقلش تحوّل کرد نیست"

بحث کے اس مرحلے پر قاری کے ذہن میں اُبھرنے والے چند سوالات کے جواب میں یہیں اختصار کے ساتھ دُوں گا۔ پہلا اہم ترین سوال جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ رسالت کی غرض و غایت یا سبب کیا ہے؟ اور یہ کہ آخر کس بنیاد پر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض کو اس منصبِ جلیلہ پر فائز کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ نبوّت و رسالت کے اجراء کا تعلّق کائنات میں جاری ارتقائی عمل سے ہے اس لیے خود اس کی توجیہہ بھی عمومی انسانی ارتقاء کے اغراض و مقاصد اور اسباب و علل کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔

۱۔ ارتقاء کے اسباب

جیسا کہ سطورِ بالا میں تصریح کی جا چکی ہے ارتقاء کا اصل سبب خالقِ کائنات کی مشیت ہے

جو کائنات میں ایک لہر کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہی ارادہ و مشیت کائنات کو مختلف ارتقائی مراحل سے گزار کر اکمل ترین مرحلے تک پہنچاتا ہے۔ شعور کی یہ لہر یا یہ قوتِ ارادہ حیوانی سطح تک زندگی، جوشِ حیات (برگساں کے الفاظ میں) یا شعور تک محدود رہتا ہے۔ انسانی سطح پر یہ فرائڈ کے الفاظ میں 'لیبیڈو' کی شکل اختیار کر لیتا ہے، لیکن فی الحقیقت یہ جنسی تحریکات اور خواہشات کا محور نہیں بلکہ حسنِ ازلی اور کمالِ ذات کے حصول کا خواہاں ہے اور اس کا ظہور نصب العین سے محبّت کی شکل میں ہوتا ہے۔

چونکہ کائنات کے ارتقاء میں بھی بالعموم کمالِ ذات کی طرف رجحان ہے اس لیے حیوانوں کی سطح پر اس خواہشِ کمال کا مظہر حیاتیاتی اعتبار سے مکمّل ترین ذی حیات نوع یعنی انسان کی آمد ہے۔ خواہش کمال انسانی سطح پر ایک ایسے مکمّل انسانی معاشرے کی تشکیل پر اُبھارتا ہے جو اکمل ترین نظریۂ حیات پر استوار ہو اور نفسیاتی اور اخلاقی ہر دو اعتبارات سے جامع اور مکمّل ہو۔

بقیہ: کاروانِ حدیث

4۔ ابن عساکر، تاریخ ابن عساکر ج3 ص279
5۔ ذہبی تذکرۃ الحفاظ ج2 ص204
6۔ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج11 ص56
7۔ احمد بن خلکان، وفیات الاعیان ج2 ص383
8۔ نواب صدیق حسن خاں، اتحاف النبلاء ص387
9۔ ابن حجر، تہذیب التہذیب ج9 ص
10۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج2 ص208
11۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص121
12۔ سید محمد انور شاہ العرف الشذی ص4
13۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، حجتہ اللہ البالغہ ج1 ص121
14۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص121

گوشۂ مقصود

طاہر سعید کے نام (۱)

پشاور سے تعلق رکھنے والے ہمارے ایک دوست ڈاکٹر حافظ محمد مقصود صاحب جو خود بھی نہایت صالح نوجوان ہیں کا اپنے ایک صالح فطرت دوست طاہر سعید صدیقی کے نام ایک فکر انگیز مفصل خط جسے دین کیلئے تڑپ رکھنے والوں کیلئے ایک نمائندہ خط قرار دیا جا سکتا ہے

سچی بات تو یہ ہے کہ ذلت و نکبت اور ظلمت و جہالت کے اس دورِ فریب میں بھی مخلص و بے غرض بندگانِ خدا کی ایک ایسی معتدبہ تعداد موجود ہے جو قرآن و سنت کی کبریائی اور تقدس حرم کی پاسبانی کے لیے پروانہ وار مٹنے سے بھی نہیں چوکتے۔ مگر غلط و اختلاط اور تلبیس و التباس کے اس زمانے میں جبکہ تہذیبِ جدید کا شیطان اجتماعی طور پر ع "تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال" کے مصداق اپنی پوری قوت کے ساتھ مسندِ اقتدار پر براجمان ہو کر مَا لَكُم مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ .... لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝ (الشعراء آیت ۲۹) ترجمہ :۔ "اگر میرے سوا کسی کو خدا مان لیا تو تمھیں قید و زندان کی راہ دکھا دوں گا" اور مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ (القصص آیت ۳۸) ——— ترجمہ :۔ "میں اپنے سوا تمھارے کسی دوسرے خدا کو نہیں جانتا" کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے (بشرطیکہ وہ مسلمان رہنا چاہتا ہو) جینا اگر ناممکن نہیں تو مشکل سے مشکل تر ضرور ہو گیا ہے۔ جہاں شرافت کی غریبی اور شرارت کی گرم جوش پذیرائی کا بڑا طنطنہ اور ہمہمہ ہے اور دورِ حاضر کے ایک زندہ اسکالر اور تفسیر "تدبرِ قرآن" کے مصنف مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول

"ہمارے سامنے بھی ایک دنیا ہے جو فسق و فجور سے بھری ہوئی ہے جس کے سارے افکار و نظریات یکسر باطل اور نفس پرستانہ ہیں خدا پر ایمان یا تو سرے سے موجود ہی نہیں ہے یا موجود ہے تو اس میں صد ہا رخنے ہیں۔ اللہ، رسولؐ اور آخرت کا اقرار نہیں بلکہ انکار دین بن چکا ہے۔ اور یہ دین انکار و الحاد پشت پر نہایت زبردست فلسفے رکھتا ہے اس کی ترویج و اشاعت کے لیے بڑے بڑے کالج اور بڑی بڑی یونیورسٹیاں ہیں۔ نہایت وسیع الاثر قوت ہے اور منصب سے بڑھ کر نہایت ہی طاقتور سیاسی اقتدار ہے جو تمام امر و نہی کا واحد

مالک تمام وسائل و ذرائع پر متصرّف اور تمام نفع و ضرر کا خداوند بنا ہوا ہے۔
اس دنیا کے اندر کچھ تھوڑے بہت مسلمان بھی جی رہے ہیں جو اس میں شبہ نہیں
کہ اللہ کا نام بھی لے لیتے ہیں، رسولؐ کا دم بھی بھرتے ہیں لیکن اس اعتبار سے
دونوں برابر ہیں کہ عملی زندگی سے خدا و رسولؐ کو دونوں نے الگ کر رکھا ہے
مسلمان نام تو خدا اور رسولؐ کا ضرور لیتا ہے لیکن کام انہی کے کرتا ہے جو اللہ اور
رسولؐ کے باغی ہیں۔ علم انہی کا حاصل کرتا ہے فلسفہ انہی کا سیکھتا ہے۔ تہذیب
میں، آداب میں، معاشرت میں تقلید انہی کی کرتا ہے۔ اپنا مال، اپنا وقت،
اپنی قابلیت سب کچھ انہی پر نثار کرتا ہے اور جبراً نہیں طوعاً کرتا ہے۔ صرف
کرتا ہی نہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتا ہے اور تنہا خود ہی اس فخر کو سمیٹے نہیں رکھنا
چاہتا بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی آئندہ نسلیں بھی اس فخر میں سے حصہ پائیں۔ یہ
خدا کو ماننے کا حق صرف اس طرح ادا کر دیتا ہے کہ مسجد میں اس کی نماز پڑھ دیتا ہے
اس کے نام پر کچھ زکوٰۃ دے دیتا ہے۔ مہینہ بھر کے روزے رکھ دیتا ہے باقی اس
کے سوا سارے معاملاتِ زندگی میں وہ جس خدا کی بھی اطاعت کرے اس سے
اس کے آسمانی خدا کو کوئی واسطہ ہی نہیں۔ رسولؐ کے ماننے کا حق یہ صرف اس
طرح ادا کرتا ہے کہ نمازوں میں آپؐ کی ذات پر درود بھیج دیتا ہے۔ سال میں عیدِ
میلاد کے ایک آدھ جلسے کر دیتا ہے۔ اگر آپؐ کی شان میں کوئی ادنیٰ گستاخی کسی سے
صادر ہو جائے تو اخباروں اور جلسوں میں ہنگامے برپا کر دیتا ہے۔ باقی رہی یہ
بات کہ زندگی کے تمام شعبوں میں وہی واجب الاطاعت اور انہی کا بتایا ہوا طریقہ
واجب الاتباع ہے اور اُن کے طریقے کے سوا سارے طریقے گمراہی فسق اور کفر
ہیں یہ اس کے ایمان بالرسول میں داخل نہیں ہے۔"

دورِ حاضر کے اس طوفانِ بدتمیزی پر اپنی جانب سے کچھ کہہ گزرنے کے بجائے میں نے ایک
قابلِ قدر مفسرِ قرآن کا تبصرہ پورے شرح و بسط کے ساتھ آپ کے سامنے من و عن رکھ دیا ہے۔
آج سے پندرہ سو برس پہلے جب خدا کی زمین بالکل اسی طرح ایک مثالی ظلمت کدہ بن چکی تھی۔
جہاں اخلاق پر فحاشی و عریانی، معاشرت پر محبوبات و مرغوباتِ نفسانی، معیشت پر ظالمانہ اور

استحصالی جاگیرداری اور سیاست پر غاصبانہ اور قاہرانہ بے اعتدالی کا پارہ اپنی انتہا تک پہنچ چکا تھا اور فسق و فجور اور ظلم و عدوان کی یہ تمام بے ربطیاں مل کر نہایت دھڑلے سے ایک ظالمانہ اور غاصبانہ نظامِ باطل کو غذا فراہم کر رہی تھیں تو اللہ تعالےٰ نے اس کی سرکوبی اور عوام الناس کو نظامِ شر یہ کی کارستانی سے بچانے کے لیے اپنے ایک رسولؐ کو "الھدیٰ" اور "دین الحق" دے کر مبعوث فرمایا۔ جنہوں نے بیک سر نظامِ باطل کے قہر و استبداد سے بھرپور ٹکر لینے کی مول لی۔ گو کہ وقت کے سیاسی نظام کو جبر، معاشی اور اقتصادی نظام کو استحصال اور سماجی نظام کو انسانیت کی تفریقِ خبیث سے چھٹکارا کوئی پھولوں کی سیج نہیں تھی مگر زوال و انحطاط کے ایک ایسے دور میں اُسی فردِ واحد نے اٹھ کر "الدین" کی تبلیغ شروع کی۔ جلد یا بدیر اپنے ساتھ کفن بردوش رفیقوں کی ایک جماعت تیار کی۔ پورے تیرہ سال تک مکے میں رہ کر اُسی فاشستانہ اور غاصبانہ نظام کے ظلم و تشدد کے سامنے تختۂ مشق بن کر تعذیب و ابتلا کی قہریلی بھٹی اور بے رحم چکی میں نہایت بے دردی کے ساتھ پستے رہے۔ پھر جب محسوس ہوا کہ سرفروش ساتھیوں کی ایک ایسی جمعیت فراہم ہو چکی ہے جو نظامِ باطل سے بھرپور ٹکر لے سکے تو دیکھتے ہی دیکھتے ظلم و جور کے نظام سے ایک کامیاب اور فیصلہ کن ٹکر لی اور یوں تیئیس سال کے ایک قلیل وقفے اور محنتِ شاقہ کے نتیجے میں خطۂ عرب پر اللہ تعالےٰ کے عادلانہ اور منصفانہ نظام کا جھنڈا لہرا کر شجرِ باطل کی جڑیں اور ایوانِ کفر و شرک کی چولیں ہلا دیں۔

خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
ہے تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے ہیں
ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

مگر افسوس کہ نظامِ اسلامی کا نکھار اور ایمان و یقین کا یہ موسمِ بہار تا دیر قائم نہ رہ سکا اور تیئیس

سال گزر جانے کے بعد شیر کی شیری کا یہ عظیم الشان فسانہ اور نغمۂ اللہ ہو کا فلک سوز ہنگامہ آہستہ آہستہ سرد پڑنے لگا خدا، رسولؐ اور آخرت پر ایمان مارے باندھے کی ایک اضافی اور عملی و اجتماعی زندگی پر غیر مؤثر پوٹلی بن کر دماغ کے خوابیدہ خانوں میں نہایت افسردگی کے ساتھ خلوت گزیں ہو کر بغاوت و طغیان اور ہٹ دھرمی کے ہاتھوں بکی ہوئی انسانیت کی عقل و فہم پر ماتم کرنے لگا۔ معراجِ انسانیت کی وہ گاڑی جس نے کبھی روشنی و ہدایت کی بلند و بالا میناروں اور فلک بوس چوٹیوں کو سر کر دیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے ملوکیت، خود غرضی اور مادیت کی پست ترین اندھیاس کی جانب لڑھکنے لگی۔ دریائے وقت کی خرام موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر مسلمان بالآخر آرزوئے خام اور نمازِ بے قیام کے طلسمِ ہوش رُبا و بے مقصود کا اسیر ہو گیا۔ توحید کا وہ تصور جس نے کبھی پتنگانِ شمعِ رسالت کو تحقیقِ حق کا امام اور علم و معرفتِ الٰہی کا راز دار بنا دیا تھا اور احساسِ زیاں دے کر اُنکے لہو کو جذبۂ جہاد سے گرما دیا تھا، اب فقط ایک مسئلۂ علمِ کلام اور علمِ کلام بجائے خود ایک دل لگی قوالی کا قائمقام بن کر رہ گیا۔ اُمتِ مرحومہ کی اس افسوسناک صورتحال، اس انمول حماقت اور اس نادیدہ جہالت پر ابلیس اور انکے مشیروں نے ان الفاظ میں حقارت آمیز قہقہہ لگا کر تمسخر و استہزا کی تالیاں پیٹ دیں کہ

ے ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں۔
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوّالی سے کچھ کم تر نہیں علمِ کلام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید
ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام

یہ اندوہناک اور افسوسناک حادثہ کیوں رونما ہوا ؟ یہ ایک ایسی تلخ اور دل خراش حقیقت ہے جو اپنے پیچھے ایک طویل تاریخ اور دل گداز داستان رکھتی ہے جس کا دہرانا میرے اس وقت کا موضوعِ بحث نہیں۔

مختصر یہ کہ وہ "دین" یا " نظامِ حیات" جو پاک پیغمبرؐ اپنے ساتھ لے آئے تھے اور جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھا آہستہ آہستہ نظامِ اجتماعی سے نکل کر صرف انسان کی انفرادی زندگی اور معاملات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ شیطانیت اور لادینیت (SECULARISM) کا دور دورہ ہو گیا اور انسانی زندگی کو تین تین کے مندرجہ ذیل دو گوشوں (یعنی انفرادی اور اجتماعی) میں بانٹ دیا گیا۔

ا	(۱) عقیدہ	(DOGMA)	انفرادی زندگی — اسے مذہب کا نام دیا گیا ہے
	(۲) عبادات	(RITUALS OR MODE OF WORSHIP)	
	(۳) رسوم و رواج	(WAYS & CUSTOMS OF LIFE)	
ب	(۴) معاشرتی نظام	(SOCIAL SYSTEM)	اجتماعی زندگی
	(۵) معاشی نظام	(ECONOMIC SYSTEM)	
	(۶) سیاسی نظام	(POLITICAL SYSTEM)	

زندگی (انفرادی + اجتماعی) = دین

داد دیجئے دورِ جدید کی شیطانیت کو کہ اس نے انفرادی زندگی یعنی عقیدے، عبادات اور رسوم و رواج میں تو دنیا کے تمام انسانوں کو کھلی آزادی کا پروانہ عطا کیا کہ وہ یہودیت، عیسائیت ہندومت، بدھ مت اور اسلام میں سے جس مسلک پر بھی چاہے اپنی انفرادی زندگی (عقیدے، عبادات، رسم و رواج) کی بنیاد رکھے۔ مگر اس نام نہاد آزادی کے عوض جو بھاری معاوضہ شیطان نے نقدی کی صورت میں وصول کیا وہ یہ تھا کہ اجتماعی زندگی (معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام) (POLITICO-SOCIO-ECONOMIC SYSTEM) پر قبضہ کر کے ایک جابر اور مطلق العنان خداوند بن بیٹھا اور دراصل یہی وہ بس کی گانٹھ اور بدنما دھبہ ہے جو زبانِ حال سے انسانیت کو شرم دلا رہی ہے اور یہی وہ موڑ ہے جہاں پہنچ کر ایک صحیح الطبع اور سلیم الفطرت

انسان محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ آج تک دنیا میں جتنے بھی مزکّی معلّم، مُربّی اور رہبر و رہنما گزرے ہیں انہوں نے انفرادی زندگی کی اصلاح و تعمیر کے لیے بڑے قابلِ قدر کام کیے ہیں مگر اُن میں سے کوئی بھی انسانیت کو اجتماعی زندگی کا عملی نقشہ پیش نہ کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ "CONCISE HISTORY OF THE WORLD" نامی کتاب کے مصنف جو ایک متعصب عیسائی ہے اور اپنی تحریروں میں جا بجا محمدؐ پر بڑے شنیع اور رکیک حملے کرتا ہے مگر جب اپنی کتاب میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بحث میں کود پڑتا ہے تو نفرت اور دشمنی کے باوجود علی الاعلان اور ڈنکے کی چوٹ یہ اعتراف کرتا ہے کہ "..... انسانی اخلاقیات کے بلند چوڑے وعظ تو حضرت عیسیٰؑ نے بھی بہت دیئے ہیں مگر جس شخص نے اُن اصولوں پر انسانی اخوت و حریت و مساوات کا ایک اجتماعی نظام عملاً قائم اور غالب کر کے دکھایا وہ تاریخ میں صرف اور صرف ایک ہی شخصیت ہیں جو محمدؐ کے نام سے مشہور ہیں"۔

اب اگر ایک حقیقت شناس شخص انقلابِ محمدی کے پورے سلسلے پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائے تو انہیں پہلی ہی جھلک میں آئینے کی طرح صاف نظر آئے گا کہ پیغمبرؐ نے انفرادی اور اجتماعی (حصہ ا، حصہ ب) دونوں میدانوں میں کیسی فراست اور دلیری کے ساتھ شیطان کو چاروں شانے چت گرایا۔ پڑھنے والے پر یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ پیغمبرِ انقلابؐ محض لوگوں کا عقیدہ درست کرنے کے لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ اُنؐ کے بھیجے جانے کا مقصد صرف اتنا بھی نہیں تھا کہ لوگ حج و زکوٰۃ کے قائل اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو جائیں۔ اُنؐ کی تشریف آوری کا منتہائے مقصود صرف یہ بھی نہیں تھا کہ لوگ عقیقوں، شادیوں، جنازوں اور دوسرے رسوم و رواج میں اسلامی طریقوں کے خوگر بن جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے نوعِ انسانی کا عقیدہ درست کیا۔ اُن کی عبادات میں روحانیت پھونک دی اور اُن کے رسوم و رواج اور طرزِ بود و باش میں یک رنگی و یکسانیت پیدا کی مگر یہ سب کچھ کس مقصدِ وحید کے پیشِ نظر انہوں نے سرانجام دیا؟ کس منزلِ مقصود کے عشق نے انہیں رات کے اندھیاروں اور دن کے اجالوں میں مغموم و پریشان رکھا؟ اور کس نصب العین کی تڑپ نے انہیں حرا کی خلوتوں اور سماجی زندگی کی جلوتوں میں ایک ماہیٔ بے آب کی طرح بے قرار رکھا؟ وہ عظیم الشان مقصد یہی تو تھا کہ انفرادی سطح پر ایسے جانثار پیدا اور تیار کیے جائیں جو وقت کے اُن وڈیروں،

ظالموں اور غاصبوں سے ایک بھرپور ٹکر لیں جنھوں نے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام ہائے حیات پر مشتمل انسانیت کے اجتماعی نظامِ زندگی کو اپنے ظلم و استبداد کے بدنما اور سیاہ داغوں سے داغدار بنا رکھا تھا۔ اسی مقصدِ رفیع کے حصول کے لیے انسانیت کے اس عظیم الشان محسن نے جو مٹھی بھر فوج آنکھیں فرشِ راہ کر کے، خونِ جگر دے کر مکے کی گلیوں سے ٹٹول ٹٹول کر جمع کر رکھی تھی وہ شدید جان کاہی، طویل جفاکشی اور جاں گسل پتّہ ماری سے مسلسل کفر و شرک کی اندھیریاں چیرتی، وادیٔ بدر میں اپنے سر کٹواتی، میدانِ اُحد کو اپنے خونِ دل سے لالہ زار کرتی، خندق و احزاب کا معرکۂ کارزار سر کرتی، درۂ خیبر میں اترتی، چمنستانِ کفر کی سنگلاخ اور تیرہ و تاریک وادیوں میں اپنے تنوں کا نذرانہ پیش کرتی، دوبارہ مکے کی گلیوں میں گھستی چلی گئی جہاں سے انہیں طاغوت کا خاتمہ کر کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطح پر حاکمیتِ خداوندی کی بالادستی بالفعل قائم اور نافذ کرنا تھی۔ جہاں پہنچ کر جہانوں کے ربّ الارباب کو خود یہ اعلان کرنا پڑا کہ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ آیت ۳)

؎ خونِ دل دے کے نکھاریں گے رُخِ برگِ گلاب — ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے

مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا بدقسمتی سے اجتماعی نظام پر اطاعتِ خداوندی کی یہ بالادستی تادیر قائم نہ رہ سکی اور وہ دین جو اجتماعی زندگی یا سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کا نام تھا سمٹتے سمٹتے اور سکڑتے سکڑتے مذہب کا روپ اختیار کر کے غیر اللہ کی بندگی اور [illegible] کے دورِ جدید میں ایک جوئے کم آب بن کر رہ گیا۔ اس حقیقت کی نشاندہی اقبال نے کتنی نفاست سے کی ہے کہ

؎ بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

اور یہ اعلان کیا گیا کہ انفرادی زندگی میں عقیدے کے لحاظ سے کوئی بندہ بے شک خدا کا پرستار بن سکتا ہے۔ عبادت میں وہ بے شک اللہ کے لیے پوجا پاٹ کے طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ رسوم و رواج میں انفرادی سطح پر بے شک وہ مذہبی رنگ بھر سکتا ہے مگر ایک ایسے خدا کو قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ وہ انسانیت کی اجتماعی یا سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام میں مداخلت اور دست درازی کر سکے۔ (جاری ہے)

سری لنکا میں تحریک رجوع الی القرآن کی صدائے بازگشت

ایک امید افزا مکتوب

Dr. Israr Ahmad.
Society of Servants
of Al-Quran .
Model Town Lahore.

Dear brother in Islam,

It is indeed a great pleasure to read some of your books published in English. I would like remind you of my letter of April 1986.

By now I request you to kindly send me all your English as well Urdu publication for translation. By the Grace of Almighty Allah by now I have translated your book known as "The obligations Muslims owe to the Quran " into Tamil language popularly spoken by the muslims of Sri Lanka. Insha Allah, I will be sending it for print within a month or so. I have made minor changes in some places to shoot the needs of our country. Insha Alla very soon I will be translating your other books too. But I need your Urdu publication too for comparison. Please oblige me the same. Please, let me have a written permission from you for all you publication.

Thanking you and may Allah bless you.

Brotherly yours
A.R.M. Mubarak
Nawalapitiya, SiriLanka

AUGUST 1989 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT-E-QURAN
LAHORE

VOL. 8
NO. 8

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حِکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ